لکھنؤ کی تہذیب

جو میں نے سنی، دیکھی اور محسوس کی

(یادیں)

عثمانہ اختر جمال

پاکستان میں جملہ حقوق محفوظ
Usmana Akhtar Jamal

کتاب	:	لکھنؤ کی تہذیب۔ جو میں نے سنی، دیکھی اور محسوس کی
مصنفہ	:	عثمانہ اختر جمال
جائے پیدائش مصنفہ	:	لکھنؤ، انڈیا
رہائش	:	گلبرٹ اریزونا، امریکہ (Gilbert Aizona USA)
اشاعت	:	نومبر 2022
قیمت	:	100 روپے۔ 10 ڈالرس امریکہ اور کناڈا

تقسیم کار

اٹلانٹس پبلی کیشنز، کراچی۔ دنیا بھر میں ترسیل کے لیے	021-32581720/0300-2472238
فضلی بک سپر مارکیٹ، اردو بازار، کراچی	0336-2633887/021-32629724
کتاب سرائے، اردو بازار، لاہور	042-37239884/0300-9404174
ویلکم بک پورٹ، اردو بازار، کراچی	021-32639581/32633151

فضلی بک، کراچی

میرا تعارف

میرا تعلق لکھنؤ کے معزز تعلیم یافتہ گھرانے سے ہے۔ گھر کا بہت ادبی ماحول تھا۔ شادی کے بعد امریکا آ گئی۔ لکھنا میری ہابی یا شوق ہے۔ میں اردو، ہندی اور انگلش میں لکھتی ہوں۔ بچپن سے لکھنے کا شوق تھا، مختلف ناموں سے اپنی تخلیقات بھیجتی تھی جو شائع بھی ہو جاتی تھیں۔ بہت عرصے بعد میرا افسانہ ''غیر سے رشتہ'' پاکیزہ آنچل دہلی، انڈیا میں شائع ہوا۔ اس کے بعد سے مستقل میرے افسانے، شاعری اور مضامین ہندوستان، پاکستان، امریکا اور یورپ وغیرہ کے پرچوں، ویب سائٹ، فورمز اور اخباروں میں شائع ہو رہے ہیں۔ مجھے تعلیم حاصل کرنے اور مختلف زبانیں سیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ میں نے یہ سارے شوق بھی پورے کیے۔ انڈیا سے ڈگریاں لیں اور امریکا میں بھی اپنی تعلیم جاری رکھی۔

ایم اے، بی ایڈ، کمپیوٹر: ڈگریاں

میڈیکل ٹرمنالوجی، اکاؤنٹنگ، لائبریری سائنس، صحافت اور میتھ وغیرہ میں ڈگریاں، ڈپلومے اور سرٹیفکیٹس ہیں۔ پروف ریڈنگ، پروف رائٹنگ، ایڈیٹنگ، نیوز کلپنگ، نیوز رائٹنگ اور صحافت سے بھی میری تعلیم اور جاب کا تعلق رہا ہے۔

مجھے زبانیں سیکھنے کا بہت شوق رہا ہے۔ اردو، ہندی، انگلش، سنسکرت،

فارسی، عربی زبانیں آتی ہیں۔ فرنچ اور اسپینش زبانیں سیکھنے کی کوشش کی۔ بنگالی، پنجابی اور گجراتی زبانیں دوستوں، ہندی اور سنسکرت کی بدولت خود بخود آ گئیں۔

میگزین، رسالے اور اخبارات:

''پاکیزہ آنچل'' دہلی، ''مشرقی دلہن'' دہلی، ''مشرقی آنچل'' دہلی، ''الاقرباء'' پاکستان، ''انہماک'' پاکستان، ''خرمن'' انڈیا، پاکستان، ''لاریب'' لکھنؤ، ''بیسویں صدی'' دہلی، ''دیدہ ور'' بوسٹن امریکا، ''اردو لنک امریکہ''، ''گواہ اردو'' ویکلی حیدرآباد انڈیا، ''تریاق'' ممبئی، ''تمثیل نو'' کلکتہ، اور بہت سے ہندوستان، پاکستان، یورپ اور دوسرے ملکوں کے رسالے اور ڈائجسٹ وغیرہ جن کی بہت بڑی تعداد ہے۔ فیس بک، شعر و سخن ڈاٹ کام، کمپیوٹر کے فورمز اور ویب سائٹ پر بھی میری تخلیقات شائع ہوتی رہتی ہیں۔ میں پاکستان اور انڈیا کے بہت سے رسالوں، اخباروں اور خواتین کے ڈائجسٹ وغیرہ کے نام نہیں لکھ رہی ہوں جن میں میری تخلیقات شائع ہوئی ہیں مگر خود انہوں نے مجھے نہ تو اطلاع دی اور نہ مجھے میگزین بھیجا۔

مجھے ہمیشہ میرے پبلشرز، مدیران، قارئین اور مداحوں نے ایک جملہ لکھا اور بار بار لکھا: ''آپ اتنی دور سے ادب کی خدمت کر رہی ہیں۔ آپ کی عظمت کو ہم سلام کرتے ہیں۔''

میری کتابوں کے نام:

ان کتابوں میں شامل سب افسانے اور شاعری مختلف رسالوں، اخباروں اور ڈائجسٹ وغیرہ میں بیس پچیس سال پہلے شائع ہو چکے ہیں۔ اور اپنے وقت کے بہت مشہور افسانے ہیں میرے قارئین نے بہت پسند کیا اور مجھے بہت بڑے اعزاز اور

شہرت سے سرفراز کیا۔ ان کی بدولت ادب میں مجھے اپنا ایک الگ مقام ملا۔ شکریہ۔

شاعری کا مجموعہ: ''رعنائیاں درد کی'' (عثمانہ اختر جمال)۔ عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہونے والی ہے۔

افسانوں کا مجموعہ: ''تتلیوں کے رنگ'' (عثمانہ اختر جمال) عرشیہ پبلی کیشنز دہلی سے شائع ہو چکا ہے۔

افسانوں کا مجموعہ: ''تین گلاب'' (عثمانہ اختر جمال)۔ فضلی بک کراچی سے شائع ہو چکا ہے۔

دوسری کتابیں جو ابھی لکھی جارہی ہیں اور جلد شائع ہوں گی۔

''لکھنؤ کی تہذیب جو میں نے دیکھی، سنی اور محسوس کی۔'' آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ فضلی بک کراچی سے شائع ہوا ہے۔ راشد اشرف صاحب کی دلچسپی، دیکھ ریکھ اور مہربانی سے شائع ہوا ہے۔

افسانوں کے مجموعہ: عظمت کا ستون، سسکیوں کی آواز، زخم جدائی، دل کی معصوم صدا، ونتی (ہندی)، چاندنی کا تحفہ (ہندی)۔

شاعری کا مجموعہ: اجالوں کی رہگزر۔ اردو اور ہندی میں بہت جلد شائع ہونے والے ہیں۔

عثمانہ جمال

usmanajamal15@gmail.com

usmanaaj@yahoo.com

کچھ اپنی کتاب کے بارے میں

میری کتاب ''لکھنؤ کی تہذیب، جو میں نے سنی، دیکھی اور محسوس کی'' میرے قارئین نے میری دوسری کتابوں میں اس کے بارے میں پڑھا اور اس کتاب کی فرمائش کر کے اس کو جلدی لکھنے پر مجبور کر دیا۔ میں اور کتابیں تیار کرنے میں لگی ہوئی تھی اور اس کتاب کو لکھنے پر دھیان ہی نہیں دے پا رہی تھی۔ اپنے قارئین اور خاص کر راشد اشرف صاحب کی فرمائش پر بہت جلدی مکمل کر لیا۔ اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے۔ کاش لکھنؤ والے چاہے لکھنؤ میں رہ رہے ہوں یا دنیا کے کسی بھی کونے میں رہ رہے ہوں وہ بھی بہت سے ایسے واقعات لے کر لکھنؤ کی تہذیب کو آگے بہت آگے بڑھا رہے ہوں۔ دوسروں کے سامنے مثال بن کر آ رہے ہوں۔ یہ خصوصیات دنیا کے ہر انسان میں موجود ہیں، ان کی اپنی ہیں۔ اپنی خصوصیات کو وہ لوگ بھی آگے بڑھائیں۔ تاکہ دنیا میں بڑھتی ہوئی برائیاں اور نفرت کا خاتمہ ہو جائے۔ اس میں انسانیت ہے، مساوات ہے، بھائی چارا ہے، نفرت کو ختم کرنے کا جذبہ ہے، ایک دوسرے کے لیے ہمدردی اور دنیا کی ہر وہ خوبی ہے جو بھٹکتی انسانیت کو راہ دکھاتی لگتی ہے۔ ہر انسان اپنی یہ سب خوبیاں لے کر انسانوں کو جینے کا حق دلا سکتا ہے۔ ہر کسی کے پاس یہ ایک آواز ہے دنیا سے نفرت کو مٹانے کی۔ بہت سے انسان اپنے بہت سے مسائل میں گھرے ہوئے ہیں اس پر سے ان کو بلاوجہ کے لیے دوسروں کی نفرتوں

کا بوجھ بھی اٹھانا پڑ رہا ہے۔ یہ کتاب صرف لکھنؤ یا لکھنؤ والوں کی تہذیب نہیں دکھاتی ہے یہ تو پوری دنیا کی تہذیب ہے۔ ہر انسان کی تہذیب ہے جو لوگوں کو متأثر کرتی ہے۔ان سب لوگوں کا شکریہ جو لکھنؤ کے لوگوں کی خصوصیات اور اچھی باتوں کو لکھنؤ کا نام دے دیتے ہیں۔ کتاب پسند آئے تو شکریہ اور نہ پسند آئے تو شکریہ۔ مجھے لکھنؤ کے ایک فقیر کے الفاظ یاد آ گئے جو کہتا تھا۔ ''جو دے اس کا بھی بھلا جو نہ دے اس کا بھی بھلا۔''

اب راشد اشرف صاحب یہ چھوٹی سی کتاب شائع کروانے کی ذمہ داری لے رہے ہیں۔ یہ کتاب بہت کم صفحات کی ہے کیونکہ اگر کسی کو نہ پسند آئے تب بھی وہ پوری کتاب پڑھیں اور جن کو پسند آئے تو پڑھنے میں ان کا بہت زیادہ وقت نہ ضائع نہ ہو۔

عثمانہ اختر جمال

نومبر 2022......

میر تقی میرؔ اور شہر لکھنؤ

آج اتفاق سے میر تقی میرؔ موضوع گفتگو بنے ہوئے ہیں۔ مجھے تو محمد طارق غازی صاحب کناڈا (طارق بھائی) کے اس مشہور شعر نے خود بخود میر تقی میرؔ اور لکھنؤ تک پہنچا دیا۔

جہاں سے ریل کی پٹری گزر رہی ہے میاں
وہاں سنا ہے کبھو میرؔ کا مزار سا تھا

یہ شعر نہ صرف اہل لکھنؤ کے لیے بلکہ شہر لکھنؤ کے لیے بھی ایک فریاد بن گیا۔ لکھنؤ کے کونے کونے سے جیسے صدائیں آنے لگیں:

ہمارے آگے تیرا جب کسو نے نام لیا
دل ستم زدہ کو ہم نے تھام تھام لیا

اس شہر کی تو میرؔ جان تھے اس کا فخر تھے۔ زبان کی نازکی تو پورے شہر کی نزاکت کو اپنے اندر سموئے ہوئے تھی۔ جس سے ظاہر ہے کہ میرؔ نے ہی لکھنؤ کو نہیں اپنایا تھا لکھنؤ نے بھی میرؔ کو اپنا لیا تھا۔ لکھنؤ والے ان کو بھولے نہیں تھے۔ میرؔ تو لکھنؤ والوں کا دل ہیں، ان کا ناز ہیں۔ ان کے لیے کام بھی ہوا تھا۔ ایک سڑک ان کے نام سے منسوب کی گئی تھی۔ اب ریل کی پٹری انگریزوں نے قبرستان سے گزار دی تو بیچارہ لکھنؤ کیا کرے۔ مجھے یاد ہے جب میں بہت چھوٹی تھی تو میرے گھر کے لوگ اور

باہر کے بہت سے لوگ مل کر میرؔ کی قبر دیکھنے گئے تھے۔ پتا نہیں وہ اصلی قبر تھی کہ نہیں۔ پرانے لکھنؤ کے سٹی اسٹیشن کی عمارت کے باہر یا آس پاس سڑک پر ریل کی پٹری گزر رہی تھی۔ سڑک کے ایک طرف ہم لوگ کھڑے تھے اور پٹری کے دوسری طرف پٹری سے بالکل ملی ایک پکی قبر تھی بالکل ویسی ہی جیسی لکھنؤ کے ہر طرف شہید مردوں کی قبریں ہیں۔ اتنے میں ٹرین گزری، جو ہم سب کو ہلا رہی تھی قبر بھی ہل رہی ہوگی۔ ٹرین گزرنے کے بعد لوگ پڑھ رہے تھے۔

سرہانے میرؔ کے آہستہ بولو
ابھی ٹک روتے روتے سوگیا ہے
ہوگا کسو دیوار کے سائے میں پڑا میرؔ
کیا ربط محبت سے اس آرام طلب کو

اب اس قبر کا کوئی نام ونشان نہیں ہے۔ ہمارے کچھ رشتہ دار جو قریب ہی رہتے تھے وہ لوگ میرؔ کی قبر کی تلاش میں نکلے تھے۔ وہ جگہ اب بالکل بدل گئی ہے۔ اس جگہ یا قبرستان میں اب غریب لوگوں نے اپنے گھر بنا لیے ہیں۔ سنتے ہیں کہ ایک صاحب نے بتایا کہ ان کا گھر جہاں پر ہے وہاں میرؔ کی قبر تھی۔ انہوں نے میر کی قبر کا کتبہ اور ان کی قلم دوات بھی دکھائی۔ پتا نہیں ان صاحب کی بات سچ تھی یا جھوٹ۔ لکھنؤ میں میرؔ کے نام کی سڑک بھی ہے۔ اگر آس پاس والوں سے بھی پوچھا جائے تو وہ نہیں بتا سکتے۔ مجھے پورا یقین ہے۔ سڑک کے نام کا پتھر جس پر میر تقی میرؔ مارگ لکھا تھا بالکل ٹوٹ پھوٹ چکا ہے۔ نام پڑھا نہیں جاتا ہے۔ چکبست روڈ خوب اچھی ہے۔ اس روڈ کو بھی خوب اچھا بنا دیا جائے اور ان کے نام کا خوب بڑا سا پتھر لگا دیا جائے تو

میرؔ کی شان دوبالا ہوسکتی ہے۔

پتہ پتہ بوٹا بوٹا حال ہمارا جانے ہے
جانے نہ جانے گل ہی نہ جانے باغ تو سارا جانے ہے
چارہ گری بیماریٔ دل کی رسم شہر حسن نہیں
ورنہ دلبر ناداں بھی اس درد کا چارا جانے ہے

یہ ہے ہمارے عظیم شاعر کی داستان غم۔ اکیسویں صدی کے لکھنؤ نے ان کو اپنی آغوش محبت میں رکھ کر اپنے فخر اپنی عظمت کا نشان تو بنا رکھا ہے مگر:

وہ آئے بزم میں اتنا تو سب نے دیکھا میرؔ
پھر اس کے بعد چراغوں میں روشنی نہ رہی

اس سڑک اور میر تقی میرؔ کے نام کے پتھر کی خستہ حالی کا بیان ہم اپنے ہی الفاظ میں کر سکتے ہیں۔

میری زبوں حالی کا قصّہ
کبھی تم کسی سے نہ کہنا

بہت عرصے کے بعد جب میرا لکھنؤ جانا ہوا اور میں اس سڑک سے گزری تو عبرت کا سامان دیکھا اور حیران رہ گئی۔ ٹوٹے پھوٹے میرؔ کی سڑک کے نام کے پتھر پر جانور پیشاب کر رہے تھے۔ آنکھیں بے اختیار رونے لگیں۔ اس سڑک سے میر سے میرا کتنا جذباتی لگاؤ تھا۔ کتنا اپنا پن تھا، کتنی یادیں وابستہ تھیں جو صرف آنسو بن کر آنکھوں میں سما سکتی تھیں۔ اگر میرے پاس دولت ہوتی تو میں سب سے پہلے اس سڑک کو ایک نئی شان دیتی، اس مکان کو ایک یادگار بنا دیتی۔ میرؔ کے نام سے ٹورسٹ

لوگوں کو آنے کی دعوت دیتی ہوئی ایک خوبصورت یادگار بنوادیتی جو میرؔ کے شایانِ شان ایک عظیم الشان یادگار رہوتی۔ کاش کہ یہ میرے بس میں ہوتا۔ کبھی نہ کبھی کسی نہ کسی کو اللہ وہ دولت وہ توفیق دے گا جو میرؔ کی عظمت کا نشان بن جائیں گے۔ جیسے لاری صاحب نے ہمت کر کے ایک سڑک بنوادی تھی۔ میں لاری صاحب اور ان کی فیملی کو اس عظیم کام کے لیے خراج عقیدت پیش کرتی ہوں۔ امید ہے پھر کوئی اور بھی ان کی طرح اٹھے گا اور دنیا کے سامنے رکھ دے گا ایک جگمگ کرتی ہوئی خوبصورت سڑک اور اس کے آس پاس ان کے نام کی یادگار عمارت۔ آج کی میرؔ کی سڑک اپنے وقت میں اونچی سڑک کے نام سے مشہور ایک سڑک کا حصّہ ہے جو بہت اچھی سی چوڑی چوڑی سی سڑک تھی صاف صاف فٹ پاتھ کے ساتھ۔ وہ سڑک مجھے بہت پسند تھی مگر اب وہ سڑک بھی اپنا وجود کھو بیٹھی ہے، تو اس کے ایک حصّے سے وابستہ میرؔ تقی میرؔ مارگ کا حال تو خراب ہونا ہی تھا۔ میر اور لکھنؤ تو اپنے دل سے لگے ہیں اپنی زندگی کی داستان ہیں۔ کیونکہ میر کے لیے کام ہوتا ہوا میں نے آنکھ کھول کر دیکھا تھا اس لیے میرؔ کو میں جانتی ہوں، پہچانتی ہوں، وہ مجھے اپنے اپنے لگتے ہیں۔ ہر شاعر سے زیادہ قریب لگتے ہیں۔ میرؔ کے ذکر سے، میرؔ سے وابستہ جگہ کی تلاش سے، اس جگہ کو کیسے سنوارا جائے، اس جگہ کو کیسے نکھارا جائے، کیسے اس کا وجود قائم رکھا جائے ہر وقت یہ ہی باتیں کانوں میں پڑتی تھیں اور یہ ہی باتیں دکھائی بھی دیتی تھیں کبھی ایک سڑک بن کر، کبھی ایک قبر بن کر اور کبھی ایک مکان بن کر جہاں میرؔ کی قبر کا کتبہ اور قلم دوات تھی۔ میں نے خود کچھ بھی نہیں کیا مگر میرا وجود ان کے ساتھ تھا جو یہ عظیم کارنامہ انجام دینے کی کوشش کر رہے تھے یا کر چکے تھے۔ اور اس وقت ہر طرف ایک داستان میرؔ تھی

جو سنائی دے رہی تھی، نظر آ رہی تھی۔ میرؔ کی شاعری میں شاید اسی لیے درد تھا کہ وہ صدیوں تک درد کا نشان بنی رہے۔ ہر نئی صدی اس درد کو دیکھے اور تڑپے کبھی ریل کی پٹری کے پاس کی قبر بن کر، کبھی قبر کا کتبہ اور قلم دوات تھامے ایک گھر بن کر اور کبھی ٹوٹے پھوٹے پتھر پر مٹا مٹا میر تقی میرؔ مارگ کا نام بن کر اپنی بدحالی کا شکوہ ہر زمانے ہر صدی سے کرتی رہے۔

2 مارچ 2009ء

◆ ÷ ◆

لکھنؤ کی تہذیب

...جو میں نے سنی، دیکھی اور محسوس کی

لکھنؤ ایک ایسا شہر ہے جو اپنی ندرت، اپنی تہذیب سے دنیا سے الگ نظر آتا ہے۔ اس کی شہرت کا ایک الگ انداز ہے۔ لکھنؤ کی اعلیٰ تہذیب کے بہت سے واقعات میں نے سنے، پڑھے اور ان کی عظمت کو محسوس کیا۔ پھر اپنے اردگرد اپنی زندگی میں گزرتے ہوئے دیکھا تو ان کی حقیقت، ان کی بڑائی کی قائل ہوگئی۔ کسی اور کو قائل نہیں کرنا پڑا۔ وہ لوگ خود ہی قائل تھے، بلکہ ہم لکھنؤ والوں کو بھی قائل کردیا۔ خود مجھ کو نہیں پتا تھا کہ ہم لوگ اور ہمارا شہر تہذیب کی عظیم الشان دولت سے مالا مال ہے۔ کبھی کبھی لکھنؤ کے باہر کے لوگوں کو لکھنؤ آکر وہاں کے لوگوں میں تہذیب کو ڈھونڈتے ہوئے پایا ضرور تھا، مگر وہ ہم لکھنؤ والوں کو مذاق لگتا تھا۔ بہت سے واقعات میں نے سنے ہیں وہ تاریخ ہیں یا حقیقت ہیں ان پر میں نے خود کوئی تحقیق نہیں کی۔ صرف سن کر اور پڑھ کر انہیں اپنا لیا، کیونکہ وہ داستانیں، وہ واقعات اپنے شہر لکھنؤ سے وابستہ ہیں۔ کسی تاریخ داں نے اس پر تحقیق کر کے لکھا ہے یا کوئی تاریخ داں اس پر تحقیق کرے گا یہ میں نہیں بتا سکتی۔ یہ تو وقت بتائے گا۔ میں تو سنے ہوئے ان قصّوں کو صرف اپنا سکتی ہوں، اپنا بنا سکتی ہیں، محسوس کر سکتی ہوں اور لکھ سکتی ہوں۔ یہ نوابوں کا شہر ہے، یہ مسکرانے کا شہر ہے۔ یہ میر تقی میرؔ کا شہر ہے۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ میرا شہر ہے۔ جب تک میں لکھنؤ سے باہر نہیں نکلی تھی مجھے معلوم ہی نہیں تھا کہ لکھنؤ کے پاس تہذیب کا اتنا بڑا خزانہ ہے۔ اس خزانے کی اتنی شہرت ہے۔ سنی ہوئی باتوں کے ساتھ

اپنی خود دیکھی اور محسوس کی ہوئی باتیں اور واقعات یاد آنے لگے۔ یہ زندگی میں گزرے ہوئے معمولی معمولی واقعات تھے۔ ان پر کون دھیان دیتا ہے، کون یاد رکھتا ہے۔ مگر ایک دم سے مجھے غیر معمولی لگنے لگے۔ لکھنؤ کی تہذیب کا ہی نہیں انسانیت کا بہت بڑا سبق پڑھانے لگے۔ کارل مارکس نے کہا تھا تاریخ بادشاہوں کی نہیں عام انسانوں کی مزدوروں کی ہونا چاہیے۔ میرے لکھنؤ کی اس تہذیب میں، انسانیت کے ان مظاہروں میں بادشاہوں کے ساتھ عام لوگ بھی شامل گئے جو لکھنؤ کی تہذیب کے علمبردار بن گئے۔ لکھنؤ کے اندر داخل ہوتے ہی آپ کی نظر جگہ جگہ لگے پوسٹرز پر پڑے گی جس پر لکھا ہوگا: ''مسکرائیے کہ آپ لکھنؤ میں ہیں۔'' میں کہوں گی کہ مسکرائیے کہ آپ لکھنؤ میں داخل ہو گئے۔

سنا ہے لکھنؤ شہرِ نگاراں ہے، یہاں کے دوست باوفا ہیں۔ دلوں میں جن کے پیار ہے۔ یہ لکھنؤ کی سرزمین ہے، یہ رنگ و روپ کا چمن ہے، یہ شہاب شہر کا گوہر ہے، یہ اہلِ علم کا نگر ہے، یہ شہر لالہ زار ہے، یہاں کی سب روایتیں ادب کا شاہکار ہیں، کلی کلی یہاں نازنیں ہے۔ جدھر نظر اٹھایئے بہار ہی بہار ہے۔ غریب جاں نثار اور امیر یہاں اہلِ دل ہیں۔ اے شہر لکھنؤ تجھے میرا سلام ہے۔ تیرا ہی نام دوسرا جنت کا نام ہے۔ تو ہی بہار ہے تو ہی گلبدن ہے۔ تو ہی پروانہ، تو ہی شمع، تو ہی انجمن ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پر زلفوں کی طرح مہکی ہوئی اودھ کی شام ہے۔ نغمے گلی گلی ہیں۔ ہر طرف تیرا نکھار تیرا بانکپن ہے۔ عظیم شاعر ہی ایسا بیان کر سکتے ہیں۔ وہی لکھنؤ کا مقام دنیا کو بتا سکتے ہیں۔ اس کو لالہ زار شہر بنا سکتے ہیں۔ یہاں کے رہنے والوں کے دلوں میں جو پیار ہی پیار ہے اس پیار کا پیغام سارے جہان میں پہنچا سکتے ہیں۔ شاعر نے

کلی کلی کو نازنیں بنا دیا اور ہر طرف بہار ہی بہار کا سماں دکھائی دینے لگا۔ انہوں نے کہا کیا خوب کہا۔ گانے والی خوبصورت آواز پوری دنیا میں گونج اٹھی۔ لکھنؤ کی ایک خوبصورت پہچان بنا گئی۔ تہذیب وتمدن کو بہت اونچائی بخش گئی۔ شکیل بدایونی صاحب کے لکھے اور محمد رفیع صاحب کے گائے یہ دو نغمے جس میں لکھنؤ اور اس کی تہذیب کی مکمل عکّاسی ہے۔ جو کام لاتعداد کتابیں کرسکتی تھیں وہ کام صرف ان دو نغموں نے کیا ہے۔ لکھنے والے عظیم شاعر شکیل بدایونی صاحب کا یہ کمال لکھنؤ اور اس کے رہنے والوں کے لیے فخر ہے۔ گانے والے محمد رفیع صاحب کی عظیم آواز لکھنؤ اور لکھنؤ والوں کا فخر ہے، اور یہ دونوں نغمے فلموں کے ذریعے پوری دنیا کے سامنے پیش کرنے والے لکھنؤ والوں کا فخر ہیں۔ ان سب کے لیے یہ فخر ہمارے دلوں میں عقیدت بن کر اپنی جگہ بنا گئے۔ شاعر اور گانے والی آواز کا بخشا ہوا الفاظ کا یہ نور، یہ قصیدہ لکھنؤ ہے، لکھنؤ کی شان ہے اور ان دونوں حضرات کو ہم لکھنؤ والوں کا خراج عقیدت ہے۔ لکھنؤ سے وابستہ ان دونوں گانوں کو ہمیشہ سننے کا دل چاہتا ہے۔ جتنا سنو دل نہیں بھرتا۔ جو لوگ بھی لکھنؤ اور اس کی تہذیب کے بارے میں جاننا چاہتے ہیں وہ ان دونوں نغموں کو سن لیں۔ یہ لکھنؤ کی سرزمیں اپنا حسن اپنی تہذیب ان کے کانوں میں رس گھولتی خود بخود نمودار ہو جائے گی اور وہ کہہ اٹھیں گے۔ ”اے شہر لکھنؤ تجھے میرا اسلام ہے۔“

◆÷◆

میر تقی میرؔ جب دہلی سے لکھنؤ آئے تو لکھنؤ کو اپنا لیا۔ اسی کے ہو گئے۔ زبان کی نزاکت اور نفاست میں کھو گئے۔ سنتے ہیں اور پڑھا بھی ہے جب میر تقی میرؔ لکھنؤ آئے تو ان کا عجیب وغریب حلیہ تھا، اور اسی حلیے میں لکھنؤ کے ایک مشاعرے میں چلے

گئے۔اہل لکھنؤ ان کا حلیہ دیکھ کر ہنس رہے تھے۔ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔میرا خیال ہے کہ لکھنؤ والے وہ بھی اس وقت کے لکھنؤ والے اتنے مذاقیہ تو نہیں ہوں گے۔ہوسکتا ہے کہ اکیسویں صدی کے لکھنؤ والے اب ایسے ہوں۔مگر جب لکھنؤ والوں کو معلوم ہوا کہ وہ میر تقی میرؔ ہیں تو سب نے اپنے پیار کی دولت لٹا دی۔اتنی عزت اتنا احترام دیا کہ نہ صرف میر تقی میرؔ بلکہ پورا اردو ادب اس عظمت سے سرخرو ہوگیا۔یہ سنی اور پڑھی ہوئی داستان بدتہذیبی میں بھی اپنی تہذیب کے جلوے دکھا گئی۔

لکھنؤ کی ایک کہاوت بہت سنائی دیتی ہے۔''جسے نہ دے مولا اسے دے آصف الدولہ۔'' یہ کہاوت لکھنؤ کی اعلیٰ تہذیب بن گئی۔تہذیب کا معیار بن گئی۔یہ کہاوت لکھنؤ کی تاریخ بن کر شاندار امام باڑوں میں تبدیل ہوگئی۔سنا ہے کہ بہت بڑا قحط پڑا تھا۔سب لوگ پریشان تھے۔شرفاء کی روزی کا کوئی ذریعہ نہیں تھا۔غریب لوگ بھی پریشان تھے۔نواب آصف الدولہ نے اپنی پریشان رعایا اور خاص کر پریشان شرفاء کے لیے امام باڑے بنوانے کا کام شروع کروایا۔رات کے وقت شرفاء اپنا منہ چھپا کر کام کرتے تھے اور صبح غریب لوگوں اور بے کار مزدوروں کے ذریعے اس عمارت کو گرا دیا جاتا تھا تاکہ رات کو پھر شرفاء ان پر کام کرکے اپنی روزی روٹی کا انتظام کرسکیں اور دن میں غریب لوگوں کو روزی مل سکے۔ان کی دور حکومت میں کوئی بھوکا نہ رہے۔واقعی میں اپنی رعایا کا اتنا خیال رکھنے والے نواب لکھنؤ میں ہی ہوسکتے تھے۔ایسا خیال، ایسی عزت، ایسا وقار لکھنؤ کی ہی داستانوں میں سنائی دیتے ہیں۔ورنہ اکیسویں صدی کے لکھنؤ کے حاکم تو اپنے وقت کے بلڈوزر ہیں جو غریبوں یا اپنی عزت کو چھپائے ہوئے غریب شرفاء کو ستانے نکل پڑتے ہیں اور بلڈوزر کا زور

دکھانے عمارتوں کو گرانے لگتے ہیں جس میں غریب اور غریب ہو جاتا ہے۔ سڑک پر آجاتا ہے۔ شرفاء کی عزت خاک میں مل جاتی ہے۔ اگر ان میں بھی انسانیت ہوتی، اپنے عہدے کا وقار ہوتا، اپنی ذمہ داری کا احساس ہوتا تو وہ بھی نواب آصف الدولہ کی طرح غریب، بے کار بھوکے لوگوں کو روزی مہیا کر سکتے تو یہ بلڈوزر بھی ایک میوزیم میں رکھنے کے قابل ہو جاتے اور بلڈوزر سے گرائی عمارتوں کو نواب صاحب کی گرائی عمارتوں کا درجہ مل جاتا۔ یہ بلڈوزر سے گرائی عمارتوں کو نواب آصف الدولہ کی بنائی ہوئی تہذیب کی طرح ان کو اکیسویں صدی کے لکھنؤ کی تہذیب کا نام مل جاتا۔ ان کے نام کی تختی ہمارے شہر کی تہذیب بن جاتی اور ایک نئے انداز سے لکھی ہوئی جلوہ افروز ہوتی۔ ان بلڈوزر والوں کو ایک خونخوار حاکم یا سیاست داں کا نام نہیں ملتا۔ لکھنؤ کے نوابوں نے پورے شہر کو خوبصورت عمارتوں اور عالیشان امام باڑوں سے سجا کر ایک تاریخ بنا دی۔ ایک ایسا تاریخی شہر بنا دیا جس کو دیکھنے دور دور سے لوگ آتے ہیں۔ جب گائڈ لوگ اس کی تاریخ اور بنوانے کی وجہ بتاتے ہیں تو سیاح بہت متأثر ہوتے ہیں اور ان داستانوں کو اور اس کے اندر چھپی حقیقت کو اپنے ساتھ لے جاتے ہیں۔ وہی لوگ لکھنؤ کو تہذیب وتمدن کا شہر بنا دیتے ہیں۔

ایک نواب لکھنؤ کو انگریز تہذیب یافتہ لکھنؤ سے اٹھا کر دوسرے شہر نہ بھیجتے اگر انہوں نے بھی ہم لوگوں کی طرح لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں سنا ہوتا۔ سنتے ہیں کہ ایک نواب صاحب نے انگریزوں کی دعوت کی اور کھانے کے بعد انہوں نے سونے کی ہیرے جواہرات جڑی پلیٹ میں پان پیش کیے۔ مہمان انگریز پلیٹ دیکھ کر بہت متأثر ہوئے اور اس پلیٹ کی بہت تعریف کی۔ نواب صاحب نے اپنے باورچی

کو حکم دیا۔ ''صاحب کو ایک سو پلیٹیں تحفے میں دے دو۔'' انگریز مہمان حیران رہ گیا اور سوچا کہ ان کے پاس ایسی ایسی کتنی دولت سے بھری پلیٹیں ہوں گی۔ انہوں نے صرف تعریف سن کر سو پلیٹیں ان کو دے دی ہیں تو ضرور وہ پلیٹیں ہزاروں لاکھوں کی تعداد میں ہوں گی۔ مگر انگریز مہمان کو شاید یہ نہیں معلوم تھا کہ یہ لکھنؤ کی تہذیب کا نادر و نایاب نمونہ بھی ہوسکتی تھی۔ نواب صاحب کی مہمان نوازی کی اعلیٰ مثال بھی ہوسکتی تھی جو انہوں نے سب پلیٹیں اس انگریز کو دے دیا، اور اپنے پاس کچھ نہیں رکھا۔ ایسی تہذیب ایسی مہمان نوازی انہوں نے کبھی اور کہیں نہیں دیکھی ہوگی۔ اگر آج کے لکھنؤ کے باہر سے آئے ہوئے سیاستداں حکمراں ہوتے تو میزبان انگریزوں کو پلیٹیں بیچ دیتے۔ پیسہ پبلک کے خزانے میں رکھنے کے بجائے اور پبلک کی بہبودی میں خرچ کرنے کے بجائے اپنے پاس رکھتے اور اپنے بچوں کو بیرون ممالک میں پڑھائی کے بہانے بھیج کر عیش کرواتے۔ سنا ہے کہ جب انگریزوں نے لکھنؤ فتح کر لیا تو ان کو ان ہزاروں پلیٹوں اور نواب صاحب کے خزانے کی تلاش ہوئی جس کا تصور انہوں نے کیا تھا۔ باورچی کو گرفتار کر کے خزانے کی بابت معلوم کرنے کی کوشش کی۔ باورچی نے کچھ نہیں بتایا۔ خاموش رہا۔ اس کو اپنے مالک کا بھرم رکھنا تھا۔ ہوسکتا ہے سخی نواب نے اس انگریز کو جتنی پلیٹیں تھیں سب دے دی ہوں۔ کوئی خزانہ نہ ہو۔ باورچی پر انگریزوں کا تشدد جاری رہا۔ اس وفادار ملازم نے اپنی زبان نہیں کھولی کہ نواب کے پاس کوئی خزانہ تھا یا نہیں تھا۔ آج بھی لکھنؤ والے اس خزانے کے بارے میں سوچتے ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ امام باڑوں کے پاس جو باولی ہے وہاں خزانہ دفن ہے۔ سنا ہے باورچی کی وفاداری کے صلے میں اسے پھانسی دے دی گئی۔ انگریز خزانہ ڈھونڈتے

رہے، مگران کوخزانہ نہیں ملا۔ یہ بھی سنا ہے کہ آج بھی اس بات اور تاریخ کو دہرایا جاتا ہے اور لوگ یقین رکھتے ہیں کہ نواب صاحب کا خزانہ امام باڑوں کے پاس والی باؤلی میں دفن ہے۔ لکھنؤ کی دولت اور پوشیدہ خزانوں کی کہانیاں آج بھی عام ہیں اور سننے میں آتی ہیں۔ ہر کسی کو وہم ہے یا امید ہے کہ نوابوں کے وقت کے بنے ہوئے پرانے گھروں میں بھی خزانہ دفن ہے۔ مگر وہ خزانہ آج تک برآمد نہیں ہوا۔ بس ہر کوئی ایک کہانی سناتا تھا کہ اس کے گھر میں کہیں نہ کہیں خزانہ ہے۔ ہو بھی سکتا ہے کیونکہ پرانے وقت میں لوگ سونے چاندی کے زیور اور سونے چاندی کے سکّے زمین کے اندر چھپا دیتے تھے۔ لکھنؤ کے کچھ لوگ سود پر روپیہ دیتے تھے اور زیور گروی رکھتے تھے۔ بہت سے لوگ اپنا زیور گروی تو رکھ دیتے تھے مگران کے پاس پیسے ہی نہیں ہوتے تھے کہ وہ اپنا زیور واپس لے جاتے۔ گروی رکھنے والوں کے پاس اتنا زیور جمع ہو گیا کہ چور ڈاکوؤں کا خوف پیدا ہو گیا۔ ان کے ڈر سے انہوں نے گھر کے کھمبوں میں زیور چھپا دیے تھے۔ سنا ہے کہ آج بھی کھمبوں میں زیور چھپے ہیں۔ سنی ہوئی بات ہے، ہوسکتا ہے کہ چور ڈاکو لوٹنے نہ آجائیں تو انہوں نے ایسی افواہیں پھیلا دی ہوں، اور یہ صرف افواہ ہو۔

◆

انگریزوں کے ساتھ بہادری سے لڑنے والی اور اپنے شہر کی عظمت اور شان کو بچانے والی بیگم حضرت محل بھی لکھنؤ کی تہذیب اور تمدن کا ایک بڑا حصّہ ہیں۔ لکھنؤ کی تہذیب ان کے نام کے بغیر ادھوری ہے۔ غلام مینا شاہ مینا صاحب بن کر آج بھی لکھنؤ کے عظیم شہنشاہ کہلاتے ہیں۔ شاہ مینا صاحب کا مزار لکھنؤ کا فخر ہے۔ کھمن پیر

صاحب کے مزار کی کتنی عجیب کہانی ہے جوان کی عظمت اور کرامات کی جیتی جاگتی مثال ہے۔ان کے مزار کو ختم کر کے انگریز ریل کی پٹریاں وہاں سے گزار رہے تھے مگر ان کے معجزے نے انگریزوں کو بھی حیران کر دیا۔جب جب پٹری بنائی جاتی وہ دوسرے دن ٹوٹی ملتی تھی۔انگریزوں نے پتا لگانے کی کوشش کی کہ پٹریاں کون توڑ دیتا ہے مگر ناکام رہے۔انہیں کوئی انسانی کام نہیں دکھائی دیا۔انگریزوں نے کام روک دیا اور پٹریاں دوسرے راستے سے نکال دیں۔آج بھی یہ معجزہ ادھوری پٹری بن کر ان کے مزار کے پاس ہے۔دادا میاں بھی اپنے شہر لکھنؤ کے عظیم بزرگ ہیں۔ایسے کتنے بزرگ لکھنؤ کی شان ہیں اوراس کی تہذیب کے معمار ہیں جن کے ذکر کے بغیر اوران کے کرامات کے سنے ہوئے واقعات کا ذکر اگر نہ کیا جائے تو لکھنؤ اوراس کی تہذیب کی داستان ادھوری ہے۔انہوں نے بھی لکھنؤ اوراس کی نہ بھولنے والی تہذیب میں ساتھ دیا تب ہی تو لکھنؤ کی تہذیب پورے ملک، پوری دنیا پر ظاہر ہوگئی، زباں زد خاص وعام ہوگئی۔ان بزرگان دین کی عظمت کو سلام۔لکھنؤ اوراس کی تہذیب کے بارے میں سنی ہوئی ہر داستان، پڑھی ہوئی ہر داستان اور دیکھی ہوئی ہر داستان اپنا فخر بن گئی۔

میں نے سنا ہے کہ ایک بار پاکستان کی ٹیم لکھنؤ کھیلنے آنے والی تھی۔لکھنؤ والے بہت خوش تھے۔گیمس کے بڑے افسر اور گیمس کی ایک خاتون آفیسر جو کہ مسلم تھیں ان کے استقبال کی تیاریوں میں لگی ہوئی تھیں۔ہمارے گھر کی لڑکیاں بھی گیمس میں تھیں۔ان کے ساتھ ٹیم کے ساتھ کھیلنے جایا کرتی تھیں اوران خاتون گیمس کی افسر سے دوستی بھی بہت تھی۔ٹیم کے خیر مقدم کی تیاری بہت تیزی سے ہو رہی تھی۔آنے والی ٹیم کے بارے میں معلومات حاصل کی گئیں۔زبان کا مسئلہ نہ ہو پنجابی، بینگالی،

سندھی زبان جاننے والوں کی خاص ٹریننگ کی گئی کہ وہ ٹرین سے اترتے ہی ان مہمانوں کا ایسا خیر مقدم کریں کہ ان کو لکھنؤ میں اجنبی پن کا احساس نہ ہو بلکہ اپنے وطن جیسا محسوس ہو۔ ان کی پسند کے کھانوں کا خاص خیال رکھا گیا۔ سنا ہے کہ ایسی تیاری تو کسی ملک کے صدر کے آنے کی بھی نہیں کی جاتی ہو گی جیسی شاندار تیاری اس ٹیم کی لکھنؤ آنے پر ہو رہی تھی۔ اس ٹیم پر لکھنؤ کے شاندار استقبال کا بہت اچھا اثر ڈالنا تھا۔ ایک ایسی مہمان نوازی کرنی تھی کہ ان کو ہمیشہ یاد رہے۔ جیسے ہی وہ لوگ ٹرین سے اترے لکھنؤ کے لوگ بجائے اردو میں بات کرنے کے ان سے پنجابی، سندھی، بینگالی اور پشتو بولتے ہوئے ملے۔ لکھنؤ والے سوچ رہے تھے کہ وہ لوگ بہت خوش ہوں گے کہ ان کا استقبال ان کی زبانوں کو بولتے ہوئے کیا گیا۔ پاکستان کی پوری ٹیم اور ان کے افسر حیران رہ گئے۔ سب نے ایک ساتھ کہا۔ ''ہم اپنے ملک میں نہیں ہیں ہم تو لکھنؤ میں ہیں۔ لکھنؤ والے کہاں ہیں۔ لکھنؤ کی زبان بولنے والے کہاں ہیں؟ ہمیں ان سے ملنا ہے۔'' کسی کی سمجھ میں نہں آیا کہ وہ کیا کہہ رہے ہیں۔ لکھنؤ والوں کو نہیں معلوم تھا کہ دوسرے ملکوں میں لکھنؤ اس کی زبان اس کی تہذیب و تمدن کا ایک الگ مقام ہے اور لکھنؤ اپنی ایک خاص شہرت اور اہمیت رکھتا ہے۔ گیمس کے بڑے افسر اور خاتون افسر گھبرا کر جلدی سے آگے بڑھے اور ان سے اردو میں بات کرنے لگے اور وہ لوگ بھی جو دوسری زبانیں بولنے کے لیے خاص کر ٹرینڈ کر کے لائے گئے تھے وہ بھی لکھنؤ میں پیدا ہوئے تھے پلے بڑھے تھے لکھنؤ کی اردو میں بات کرنے لگے۔ ٹیم کے لوگ بہت خوش ہوئے اور کہا، اب لگ رہا ہے کہ ہم لوگ لکھنؤ میں ہیں۔ دوسرے دن

کے اخباروں کی خاص سرخی تھی: ''لکھنؤ والے کہاں ہیں ان کی زبان کہاں ہے؟''

جب پاکستانی ٹیم سے دوسری زبانوں میں بات کی گئی تو انہوں نے کہا کہ لکھنؤ والے کہاں ہیں ہمیں ان سے ملنا ہے؟'' پھر تو ان کو لکھنؤ کے لوگوں سے ملوایا گیا۔ لکھنؤ کے خاص خاص گھروں میں ان کی دعوت رکھی گئی۔ خاص کر لکھنؤ کی ان جگہوں پر لے جایا گیا جہاں پر لکھنؤ کی زبان اور تہذیب اپنی پوری آن بان اور شان کے ساتھ موجود تھی۔ کوشش یہی کی گئی کہ پورے لکھنؤ میں ان کو ہر طرف لکھنؤ اور اس کی تہذیب کے نادر و نایاب نمونے نظر آئیں۔ وہ خود لکھنؤ اور اس کی تہذیب کو دیکھیں سنیں اور محسوس کریں۔ ان لوگوں کو لکھنؤ میں اپنے اس خیر مقدم اور بہت ہی شاندار استقبال نے بہت متأثر کیا اور لکھنؤ اور اس کی تہذیب کے قائل ہو گئے۔

◆÷◆

ابھی جب میں لکھنؤ گئی تو بدلی ہوئی زبان اور تہذیب دیکھ کر دنگ رہ گئی۔ جب کبھی لکھنؤ والے ایک دوسرے کو اپنے گھر بلاتے تھے تو کہتے تھے۔ ''آپ ہمارے یہاں تشریف لائیے۔''، ''آپ ہمارے گھر آیئے ہم کو خوشی ہوگی۔'' میری سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ جب کسی نے مجھ سے کہا۔ ''بہت دن ہو گئے آپ انڈیا نہیں آئیں۔ آیئے لکھنؤ گھوم جایئے۔''

میں نے جواب دیا تھا۔ ''لکھنؤ کو کیا گھومنا۔ وہ گھوما ہوا ہے۔ وہیں پیدا ہوئے ہیں پلے بڑھے ہیں۔ جب لوگ پہلی بار لکھنؤ آتے تھے تو ہم لوگ ضرور ان کو لکھنؤ گھومایا کرتے تھے۔'' مجھ کو نہیں معلوم تھا کہ وہ مجھے لکھنؤ آنے کی دعوت دے رہی

ہیں جو میں سمجھ نہیں سکی۔ جب میں لکھنؤ گئی اور اس وقت کسی نے مجھ سے کہا۔ ''آپ لکھنؤ میں ہیں تو ہمارے یہاں بھی گھوم جایئے۔'' تو میں واقعی میں گھوم گئی۔ میری بہن نے بتایا۔ ''اب جب بہت سے لوگ اپنے گھر آنے کی دعوت دیتے ہیں تو کہتے ہیں آیئے ہمارے یہاں گھوم جایئے۔''

سنا ہے کہ لکھنؤ وہ تہذیب یافتہ شہر ہے جہاں ہندو، مسلم، سکھ اور عیسائی وغیرہ ایسے رہتے تھے کہ لگتا ہی نہیں تھا کہ ان میں کوئی فرق ہے۔ ایک سی تہذیب ایک سی چاہت، ایک سا رہن سہن۔ ایک دوسرے کے تہواروں کو خوشی خوشی منانے والے ایک دوسرے کے تہواروں میں شامل ہونے والے۔ بھائی چارے کی ایسی مثال پوری دنیا میں نہیں تھی۔ سنا ہے کہ ہماری ہندو مسلم دو دوستوں کی پرنانیوں میں بہت دوستی تھی۔ دونوں ہی ٹوپی والا برقعہ پہنتی تھیں۔ ایک ساتھ ہر جگہ آتی جاتی تھیں۔ پورا وقت ایک دوسرے کے ساتھ گزارتی تھیں مگر ایک دوسرے کے گھر کا کھانا یا کوئی چیز نہیں کھاتی تھیں، یہاں تک پانی تک نہیں پیتی تھیں۔ یہ لکھنؤ کی تہذیب تو نہیں تھی یہ لکھنؤ کے باہر کا قصّہ تھا جو لکھنؤ والے ایک دوسرے کو سناتے تھے اور اتنی عجیب وغریب تہذیب اور دوستی پر خوب ہنستے تھے۔ محرم کے غم میں ڈوبے دس دن لکھنؤ کی تہذیب کا بہت اعلیٰ نمونہ تھے۔ سب ہندو مسلم سکھ عیسائی تعزیے رکھتے تھے۔ رام سواروپ کا تعزیہ باجوں کے ساتھ اٹھتا تھا۔ رام سواروپ ہندو تھے۔ ان کو حضرت امام حسین سے بہت عقیدت تھی اس لیے وہ تعزیہ رکھتے تھے۔ ان کے گھر کا تعزیہ غمگین دھن بجاتے باجوں کے ساتھ اٹھتا تھا۔ دس دن تک ان کا غم میں ڈوبا باجا بجتا رہتا تھا۔ خوبصورت عالیشان امام باڑوں میں روشنی ہوتی تھی۔ سڑکوں پر جاڑوں میں چائے کی اور گرمی میں شربت کی

سبیلیں لگتی تھیں۔ لکھنؤ کا محرم اپنے غم اور اپنے وقار کے لیے پوری دنیا میں مشہور ہے۔ محرم اور سفر کے مہینے میں گھر گھر سے مجلس کی آوازیں آتی تھیں۔ ربیع الاوّل کے مہینے میں بارہ دن تک ہر گھر سے میلاد کی آوازیں آتی تھیں اور پورے مہینے یہ سلسلہ جاری رہتا تھا۔ بارہ ربیع الاوّل کو گھر گھر اور پورے شہر میں روشنی ہوتی تھی۔ پورے شہر کے محلّوں کی روشنی کا مقابلہ کیا جاتا تھا، اور سب سے اچھی سجاوٹ پر انعام دیا جاتا تھا۔ گیارہ ربیع الاوّل کو پوری رات نعتیہ مشاعرہ ہوتا تھا جس میں پوری دنیا کے شاعر مدعو کیے جاتے تھے اور مشاعرہ سننے والوں میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے۔ سنا ہے کہ جگر مرادآبادی نے اپنی مشہور نعت ''ایک رند ہے اور مدحت سلطان مدینہ'' لکھنؤ کے اس مشاعرے میں رو رو کر پڑھی تھی اور پوری پبلک کو رلا دیا تھا۔ اس دن بھی موسم کے مطابق شربت، پانی اور چائے کی سبیلیں رکھی جاتی تھیں۔ کہیں کہیں چوراہوں پر لوگوں کو بریانی بھی بانٹی جاتی تھی۔ دیوالی کے موقعہ پر پورا شہر روشنی سے جگمگا اٹھتا تھا۔ آتش بازی تیوہار کو اور رونق بخشتی تھی۔ شب برات کے دن بھی آتش بازی اور پٹاخے چھوڑے جاتے تھے اور گھر گھر قسم قسم کے حلوے بنتے تھے۔ بڑے دن یا کرسمس کے دن گرجا گھروں یا چرچ میں اور بہت سے انگلش اسکولوں میں بھی روشنی کی جاتی تھی اور کرسمس ٹری رکھے جاتے تھے۔ سب عیسائی گھروں میں بھی کرسمس ٹری رکھے جاتے تھے۔ شہر میں روشنی چاہے جس کے تیوہار کی ہوتی پورا لکھنؤ شہر دیکھنے جاتا تھا۔ پورا شہر ایک دوسرے کے ساتھ رہتا تھا اور سب لوگ مل کر ان خاص خاص موقعوں اور تیوہاروں کو رونق بخشتے تھے۔ لکھنؤ ایک ایسا شہر تھا جہاں اتنے تیوہار منائے جاتے تھے جتنے پوری دنیا میں کہیں نہیں منائے جاتے ہیں، کیونکہ ہر مذہب کے تیوہار میں قریب

قریب پورا شہر حصّہ لیتا تھا۔ ہر وقت مذہبی جلوس نکلتے تھے۔اس میں ہر مذہب کے لوگ شامل ہوتے تھے یا سڑک کے کنارے کھڑے ہوکر دیکھتے تھے۔ ہر موقعہ پر میلے بھی بہت لگتے تھے۔

بسنت کا تیوہار ایک طرح سے سب لوگ مناتے تھے حالانکہ وہ ہندوؤں کا خاص تیوہار ہوتا تھا۔پتنگیں اڑائی جاتی تھیں۔ پتنگ بازی کے مقابلے میں سب لوگ حصّہ لیتے تھے۔ بہت بڑا میلہ لگتا تھا۔لکھنؤ میں بہت سے تیوہاروں میں میلے لگتے ہیں۔ایک بار میں اپنی ایک دوست کے یہاں جارہی تھی۔امی نے کہا۔''اکیلے نہیں جانا ہے، بوا کو ساتھ لے جاؤ''بوا پیلے رنگ کا برقعہ اوڑھتی تھیں۔ان کے ساتھ جانے کا میں تصور بھی نہیں کرسکتی تھی مگر مجبوری تھی ان کو ساتھ لے جانا پڑا کیونکہ مجھے معلوم تھا کہ امی اکیلے نہیں جانے دیں گی۔ اپنی دوست کے گھر سے واپسی میں وہ سڑک بند ہوگئی جہاں سے مجھے واپس گھر جانا تھا۔اس جگہ پر دیوالی کے بعد وہاں کا مشہور میلہ لگتا تھا۔اس دن سے وہ میلہ لگنا شروع ہوگیا۔وہ میلہ پندرہ دن تک لگتا تھا۔اسی دن سڑک کی دونوں طرف میلے والوں کی دکانیں بھی لگ گئیں تھیں۔رکشہ رک گیا۔ بوا کا پیلے رنگ کا برقعہ مجھے بہت برا لگنے لگا،مگر شکر تھا کہ میں اکیلی نہیں تھی بوا میرے ساتھ تھیں۔ایک دم سے چار پانچ آدمی بھیڑ کو ہٹا کر راستہ بنانے لگے کہ رکشہ نکل جائے۔ بھیڑ خود بھی کنارے کنارے کھڑی ہونے لگی اور رکشہ نکلنے کے لیے سڑک صاف کردی۔ حالانکہ ایسا کرتے نہیں ہیں۔ سڑک اگر بند ہے تو بند ہے۔ٹریفک والوں کو معلوم ہوتا ہے کوئی بند سڑک کے اندر داخل نہیں ہوسکتا ہے سب اپنا راستہ بدل لیتے ہیں۔ جو لوگ میلہ دیکھنے آتے ہیں وہ لوگ پیدل میلہ گھومتے ہیں اور جہاں سے میلہ

شروع ہوتا ہے وہیں پر اپنی سواریوں اور کاروں سے اتر جاتے ہیں۔ اپنا شہر تھا اگر ہم لوگوں کو بھی رکشہ نکلنے کی اجازت نہیں ملتی تو ہم لوگ بھی رکشے سے اتر جاتے اور میلہ گھومتے ہوئے پیدل گھر کی طرف چلے جاتے مگر یہ لکھنؤ تھا، تہذیب یافتہ شہر۔ انہیں اچھا نہیں لگا کہ ایک رکشہ میلے میں پھنس گیا ہے اور اس پر خواتین بیٹھی ہیں اس لیے پوری بھیڑ نے مل کر بہت عزت اور احترام کے ساتھ میرا رکشہ نکلوا دیا۔ پیلے رنگ کا برقعہ دیکھا اور نہ برقعے والی اور سواری پر تعصب بھری نظر ڈالی۔ دیکھنے میں یہ ایک معمولی واقعہ ہے لیکن مجھ سے سچ پوچھا جائے تو یہ مجھے ایک غیر معمولی واقعہ لگا کیونکہ میلے کی پوری بھیڑ نے اپنی ڈیوٹی لگا دی اور اپنا فرض سمجھا کہ ایک خاتون اور ایک لڑکی کو ان کی وجہ سے پریشانی نہ اٹھانی پڑے اور وہ لوگ ساتھ خیریت کے اپنے گھر پہنچ جائیں۔ یہ بہت بڑی بات تھی اور ہمیشہ یاد رہنے والی۔ سنی ہوئی لکھنؤ کی تہذیب کے لاتعداد واقعات کے ساتھ اب یہ دیکھی ہوئی تہذیب اچانک نمودار ہوگئی اپنے ساتھ بہت سے دیکھے ہوئے واقعات لے کر۔

◆

مجھے یاد ہے کہ پورے ہندوستان میں جب لوگ بیمار ہوتے تھے تو علاج کے لیے لکھنؤ اپنے رشتے داروں اور دوستوں کے یہاں آجاتے تھے کیونکہ لکھنؤ میں علاج کروانا بہت آسان اور سستا ہوتا تھا۔ بہت سے اسپتال تھے اور زیادہ تر ڈاکٹر لکھنؤ میں رہنے والوں کی جان پہچان کے ہوتے تھے اور غریبوں کا علاج مفت میں بھی کر دیتے تھے۔ جس گھر میں ٹھیرتے تھے وہاں جتنے لوگ ہوتے تھے بیمار اور ان کے ساتھ آنے والوں کی بہت اچھی دیکھ بھال اور خدمت کرتے تھے۔ زیادہ تر مریض

ٹھیک ہو کر چلے جاتے تھے۔ ہمارے ماموں سید ایم احمد لکھنؤ کے بہت بڑے اور مشہور کالج کے لائبریرین تھے۔ ان کے طالب علم اسپتالوں وغیرہ میں ڈاکٹر بن جاتے تھے کبھی کبھی وہ خود ان لوگوں کو ڈاکٹر بننے میں مدد بھی کرتے تھے۔ وہ اپنے شہر کی اتنی مشہور شخصیت تھے کہ یونیورسٹی اور اسپتالوں میں ہیڈ آف دی ڈیپارٹمنٹ بنانے میں مدد کرتے تھے۔ نوکریاں دلوانے میں مدد کرتے تھے۔ ان کا پورے شہر اور ان جگہوں پر بہت اثر تھا۔ اگر وہ رکشے پر جاتے تھے اور کسی رکشے والے کو کھانستے دیکھتے تھے تو فوراً اس کے بارے میں پوچھتے تھے اور جب وہ بتاتا تھا کہ اس کا بخار نہیں جا رہا ہے اس کو کھانسی بھی بہت آتی ہے تو وہ پریشان ہو جاتے تھے۔ جان پہچان کا رکشے والا ہوتا یا بغیر کسی جان پہچان کا وہ فوراً ٹی بی ڈپارٹمنٹ کے جان پہچان کے ڈاکٹر کے نام ایک پرچہ لکھ کر اس کو دے دیتے تھے اور کہتے تھے اپنا ایکسرے کرواؤ اگر بیماری ہے تو اسپتال میں داخل ہو کر اپنا علاج کرواؤ۔ ان کا پرچہ معجزے کا کام کرتا اور اگر وہ بیمار نکلتا تھا تو ڈاکٹر فوراً اس کو اسپتال میں داخل کر کے اس کا علاج شروع کر دیتے تھے۔ ماموں کی وجہ سے اس کی غذا کا خاص خیال رکھواتے تھے۔ اسپتال میں دودھ اور انڈے کی طاقتور غذائیں کھا کر وہ تندرست ہو جاتا تھا کیونکہ غذا کی کمی بھی بیماری کی وجہ ہوتی تھی۔ ان سے ڈاکٹروں کے نام پرچہ لکھوانے دور دور سے غریب لوگ آتے تھے اور جب ٹھیک ہو جاتے تھے تو ان کا شکریہ ادا کرنے آتے تھے اور دوسرے لوگوں کو ان کے بارے میں بتاتے تھے۔ رشتہ داروں، دوستوں اور کسی کی سفارش پر آئے ہوئے لوگوں کو وہ خود ڈاکٹروں کے پاس لے جاتے تھے۔ ان کو لوگوں کی مدد کرنے اور اپنا قیمتی وقت دینے سے کوئی ذاتی فائدہ نہیں تھا۔ یہ ان کی انسانیت اور رحمدلی تھی۔

الیکشن میں بھی بہت سے لوگوں کو وہ جتوا دیتے تھے۔ جس کو چاہتے تھے وزیر بنوا دیتے تھے، شہر کا میئر بنوا دیتے تھے۔ ایسی شخصیت ایسے انسان صرف لکھنؤ میں ہی دکھائی دیتے ہیں۔

ایک بار ایک ڈائیریکٹر صاحب جو مدراس کے تھے مگر لکھنؤ کے پڑھے ہوئے تھے اور ماموں سید ایم احمد صاحب کے کالج کے پڑھے ہوئے تھے۔ میری بہن کی دوست ان کے انڈر پی ایچ ڈی کر رہی تھیں۔ جب ان کو ہمارے ماموں کا نام معلوم ہوا تو بہت خوش ہوئے اور خاص کر ان سے ملنے آئے۔ انہوں نے کہا۔ ''لکھنؤ جیسی تہذیب اور انسانیت میں نے کہیں نہیں دیکھی۔'' انہوں نے اپنا واقعہ بیان کیا کہ وہ کالج کے ہوسٹل میں رہتے تھے۔ ان کا فائنل امتحان ہونے والا تھا۔ ان کے پاس ہوسٹل کا خرچا اور فیس جمع کرنے کے پیسے نہیں تھے۔ وقت پر فیس نہ جمع کرنے سے ان کا سال چلا جاتا اور وہ ہاسٹل سے نکال دیے جاتے۔ ان کے پاس اپنے شہر مدراس واپس جانے کا بھی پیسہ نہیں تھا۔ ماموں کو جب پتا چلا تو وہ ان کی مدد کرنا چاہتے تھے مگر ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیسے مدد کریں۔ ڈائیریکٹ پیسہ دے کر وہ طالب علم کی خودداری کو ٹھیس نہیں پہونچانا چاہتے تھے۔ انہوں نے ان سے کہا۔ ''مجھے اپنی لائبریری کے لیے کچھ کتابیں چاہیے ہیں اگر تمھارے پاس کوئی بھی کسی قسم کی بھی کتابیں ہوں تو تم لے آؤ۔ میں اپنی لائبریری کے لیے خرید لوں گا۔ اس طرح تمھارے پاس ضرورت کے پیسے آ جائیں گے۔'' ان صاحب کے پاس کچھ کتابیں تھیں اور وہ جانتے تھے کہ وہ کتابیں بیکار تھیں اور لائبریری کے کام کی نہیں تھیں۔ مگر ان کو پیسوں کی شدید ضرورت تھی اس لیے ان کے پاس وہ کتابیں لے آئے۔ انہوں

نے وہ کتابیں لائبریری کے نام سے خود ہی خرید لیں اور ان کو اتنا پیسہ دیا جس سے ان کی فیس، ہوسٹل کی فیس اور امتحان کے بعد مدراس جانے کا کرایہ نکل آیا، اور آگے جا کر ان کو کچھ بننے کا موقع مل گیا ورنہ اگر اس سال وہ امتحان نہ دے پاتے تو ان کی زندگی برباد ہو جاتی۔ ان کی اس مدد نے ایک قابل انسان کی زندگی بنا دی ورنہ ایک ذہین آدمی پیسے نہ ہونے کی وجہ سے ختم ہو جاتا۔ گھر میں ہم لوگوں کو اس واقعہ کی خبر نہیں تھی۔ ایسے ایسے ان کی زندگی سے وابستہ لاتعداد واقعات ہوں گے جو گھر والوں سے پوشیدہ تھے۔ وہ جب کسی کی مدد کرتے تھے تو اس بات کی شہرت نہیں چاہتے تھے۔ ان کی ایک اور خوبی تھی۔ وہ اگر کسی کی مدد کرتے تھے اور وہ کچھ بن جاتا تھا تو دوسرے ضرورت مند لوگوں کی مدد وہ ان سے کروا لیتے تھے۔ ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی سب ان کی مدد سے سرفراز ہوتے تھے۔ صرف مالی مدد سے ہی نہیں بلکہ دوستی یا مروّت کی وجہ سے کوئی وزیر بن جاتا تھا، کوئی ڈاکٹر، کوئی انجینئر، کوئی پروفیسر، کوئی شہر کا میئر، کوئی ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ وغیرہ بن جاتا تھا۔ یہ طاقت یہ خوبی تو ہر انسان میں ہوتی ہے مگر لکھنؤ والوں کے لیے ان کے ساتھ ساتھ لکھنؤ کی تہذیب کے سانچے میں بھی ڈھل جاتی ہے۔

◆

میں نے دیکھا ہے ایک گھر جہاں جب کھانا پکتا تھا تو لکڑی کا استعمال ہونے کی وجہ سے دھواں نکلتا تھا۔ میری امی اپنی بالکنی سے وہ دھواں دیکھتی تھیں۔ اس کوٹھی کے رہنے والے کہیں باہر گئے ہوئے تھے اور انھوں نے اپنے کسی رشتے دار کو وہاں رکھ دیا تھا۔ شریف لوگ تھے۔ شوہر نوکری کرتے تھے جس سے گھر چلتا تھا۔ بہت چھوٹے چھوٹے تین بچے تھے۔ وہ خاندان محلے والوں کے لیے نیا تھا۔ اچانک شوہر کا

انتقال ہوگیا۔تعزیت کے لیے آنے والوں کا سلسلہ بھی ختم ہوگیا۔مہینے کی دو تاریخ تھی امی اپنی بالکنی پر کھڑی تھیں۔اچانک انہوں دیکھا کہ ان کے گھر سے کھانا پکنے کا دھواں نہیں نکل رہا ہے۔شوہر ہر مہینے تنخواہ لاتے تھے تب ہی کھانا وغیرہ بنتا تھا۔اب جب کہ شوہر ہی نہیں تھے تو تنخواہ کہاں سے آتی اور چولہا کیسے جلتا۔امی کو بہت فکر ہوگئی کہ ان کی مدد کیسے کریں؟ ایسے میں گھر گھر ان کی اور دوسرے لوگوں کی امداد ضرورت مند لوگوں تک پہنچانے والی محلے کی ایک بوا تھیں امی نے ان کو بلوایا اور ان سے فوراً کہا۔"ہم سامنے والی خاتون کی مدد کرنا چاہتے ہیں کیسے کریں کہیں وہ برا نہ مان جائیں۔" بوا نے ترکیب بتائی اور کہا۔"بیگم صاحبہ آپ کے یہاں جب گاؤں سے غلّہ اور دوسرا سامان آیا تھا تو آپ نے غریبوں کے علاوہ سب بڑے بڑے گھروں میں بھی تحفے میں بھجوایا تھا اور میں نے ہی پہنچایا تھا۔ان کو نہیں بھجوایا تھا۔اب بھجوا دیجیے۔میں اور میرے لڑکے خود لے کر جائیں گے۔میں ابھی اپنے لڑکوں کو بلواتی ہوں۔" امی کو ان کی یہ بات بہت پسند آئی۔وہ اپنے لڑکوں کو بلا لائیں اور خود ہی امی کے کہنے پر گیہوں کا پورا بورا، دال چاول، آٹا، دیسی گھی، شکر وغیرہ اپنے ساتھ لے جانے کے لیے تیار کیا۔یہ سب سامان ہمارے گھر میں موجود تھا۔ہمارے گاؤں سے آتا رہتا تھا جہاں پر ہمارے والد صاحب کی زمینیں وغیرہ تھیں اور چچا لوگ وہیں رہتے تھے۔امی نے کہا۔ "پتا نہیں ان کے یہاں لکڑیاں، بے بی کے لیے دودھ اور دوسری چیزیں ہیں کہ نہیں؟" بوا کو پیسے بھی دے دیے اور کہا۔"ان کو یہ پیسے بھی دے دینا اب وہ برا مانیں یا کچھ بھی ہو۔" سامان ان کے گھر پہنچ گیا۔اتنی مصیبت اور پریشانی میں تھیں کہ انکار نہیں کر سکیں۔دعاؤں کے ساتھ خوشی خوشی لے لیا۔پھر بوا کی مدد سے ہی محلے کی سب

عورتوں نے چندہ کر کے ان کے لیے سلائی کی مشین خرید دی۔ اور بوا کی جیسی فیملی کی عورتیں ان کے لیے گھر گھر سے سلائی کے کپڑے لانے لگیں۔ اس طرح وہ خود اپنی فیملی کا بوجھ اٹھانے کے قابل ہو گئیں۔

◆

لکھنؤ کے گھروں کا دستور تھا کہ ہفتے کا ہر دن مانگنے والوں کے آنے کے لیے مقرر تھا۔ وہ اپنے اپنے دن پر آتے تھے اور پیسے لے جاتے تھے۔ مایوس نہیں کیے جاتے تھے پیسے یا روپے ضرور ملتے تھے۔ کبھی کبھی ان پیسے لینے والوں میں شریف لوگ بھی شامل ہوتے تھے۔ دوشنبہ کے دن ہمارے یہاں ایک بڑی بی آتی تھیں جو بہت بوڑھی تھیں اور کمر سے پوری جھکی ہوئی تھیں۔ جب ایک بار میں انڈیا گئی تو اُن سے ملاقات ہوئی۔ دوسرے دن مجھے واپس امریکا آنا تھا اس لیے بہت سے رشتہ دار، میری اور میری بہنوں کی دوستیں، پڑوس کی عورتیں ملنے آئی ہوئی تھیں، مجھے باورچیوں کی پکائی ہوئی دیگ کی بریانی بہت پسند تھی۔ اس لیے خاص کر باورچی بلوا کر بریانی پکوائی جارہی تھی۔ اس دن دوشنبہ تھا اور بڑی بی کا پیسوں کے لیے آنے کا دن تھا۔ بڑی بی ہمیشہ کی طرح آئیں مگر حب اتنے بہت سے لوگوں کو دیکھا تو گھبرا گئیں۔ سمجھیں کہ غلط وقت پر آئیں ہیں۔ گھر میں کوئی فنکشن ہے تو واپس جانے لگیں۔ مگر ان کو جانے نہیں دیا گیا اور روک لیا گیا۔ وہ زمین پر بیٹھنے لگیں۔ فقیرنی تھیں تو کیا اتنی بزرگ خاتون تھیں زمین پر کیسے بیٹھنے دیا جاتا۔ وہ امی کے قریب بیٹھتی تھیں۔ ان کے لیے امی کے قریب والی کرسی خالی کر دی گئی۔ ان کا دوپٹہ، جمپر اور غرارہ جگہ جگہ سے پھٹا ہوا تھا۔ اتنے میں چائے اور ناشتہ آ گیا۔ سب سے پہلے ان کو چائے اور ناشتہ دیا

گیا۔اس کے بعد دوسرے مہمانوں کو دیا گیا۔ان کو کھانے کے لیے بھی روک لیا گیا۔ اپنی اتنی خاطر دیکھ کر ان کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔ وہ بڑی بی بتانے لگیں کہ ان کے گھر میں کوئی کمانے والا مرد نہیں ہے۔ان کی بیوہ بیٹی ٹی بی کی مریض ہے اور بستر سے لگی ہے۔اس کے چار بچے ہیں۔ان سب کا وہ اکیلی سہارا ہیں اور گھر گھر سے پیسے مانگ کر ان کی ضرورتیں پوری کرتی ہیں۔انہوں نے پورے لکھنؤ میں بہت سے گھر لگا رکھے ہیں۔ ہفتے میں ایک بار ایک ایک محلے کے گھروں میں جاتی ہیں۔ ہر گھر سے ہفتہ ملتا ہے جس سے وہ اتنے لوگوں کے کھانے کا انتظام کرتی ہیں۔کھانے کا وقت ہوتا ہے تو ان گھروں سے کھانا بھی مل جاتا ہے جو وہ خود نہیں کھاتیں ہیں بچوں اور بیمار بیٹی کے لیے گھر لے جاتیں ہیں۔انہوں نے یہ بھی بتایا کہ وہ بہرائچ کی رہنے والی ہیں۔ وہاں کے بزرگ سید سالار مسعود غازی عرف بالے میاں کے مشہور مزار پر بھیک مانگتی تھیں، مگر بہت سے فقیر ہوتے تھے تو بہت کم پیسہ ملتا تھا۔ایک بار وہ بہرائچ میں بھیک مانگ رہی تھیں تو ایک صاحب کو انہوں نے اپنی کہانی سنائی۔ ان صاحب کو بہت افسوس ہوا۔انہوں نے مشورہ دیا کہ تم لکھنؤ چلی جاؤ۔ وہاں اہل دل اور سخی لوگ رہتے ہیں۔ وہاں تم بچوں کی اچھی پرورش کر سکو گی اور وہاں اچھے سرکاری اسپتال بھی ہیں جہاں تمھاری لڑکی کا علاج بھی ہو جائے گا۔ وہ لکھنؤ چلی آئیں، اور بہت سے گھر لگا لیے ہیں جہاں سے پیسہ ملتا ہے تو ان کا گھر چلتا ہے۔ وہ صاحب واقعی میں کوئی فرشتہ تھے جنہوں نے انہیں لکھنؤ کی راہ دکھا دی۔ یہ بات اور ان کی کہانی سن کر میں اور وہاں پر موجود جتنی خواتین تھیں سب رونے لگیں۔اتنی ضعیف خاتون جن کی کمر اتنی جھکی ہوئی تھی کہ چلنے پھرنے سے مجبور لگ رہی تھیں ان کے اوپر اتنی ذمہ داریاں تھیں۔

سب کے پرس کھل گئے اور جس کے پرس میں اس وقت جتنے روپے پیسے تھے سب ان کو دے دیے۔ میرے پاس جتنے روپے تھے جو امریکا جانے کی وجہ سے اب بیکار ہونے والے تھے میں نے وہ سب ان کو دے دیے۔ ان کے پاس بہت سے روپے جمع ہو گئے۔ ان کے پھٹے کپڑے دیکھ کر ہماری بہنوں نے اپنے اور امی کے بہت سے کپڑے نکال کر ان کو دے دیے۔ میں امریکا واپس جا رہی تھی۔ بچوں نے اور میں نے انڈیا میں جو کپڑے پہنے تھے، ان کا میں نے ایک بڑا سا بیگ بنا لیا تھا کہ یہ کپڑے گھر کے نوکروں یا غریبوں کو دے دیے جائیں۔ وہ ایک ایک بار کے پہنے ہوئے نئے کپڑے تھے جنہیں واپس نہیں لے جانا تھا۔ میں نے وہ بیگ ان کو دے دیا۔ بہت سا کھانا بھی ان کے ساتھ کیا گیا۔ بھائی نے رکشہ بلوا لیا۔ رکشے والا بھی جان پہچان کا تھا اس سے ان کا سامان رکشے میں رکھوایا گیا۔ ماموں نے رکشے والے سے کہا ان کا گھر دیکھ کر آنا کل مجھے وہاں لے جانا تا کہ ان کی لڑکی کو اسپتال کے ٹی بی وارڈ میں داخل کروایا جا سکے۔ بھائی نے گھر کے پاس میونسپلٹی کے فری اسکول میں اور پاس کے مدرسے میں بچوں کا داخلہ کروا دیا۔ بڑی بی کی بیٹی اسپتال میں داخل ہو گئی اور اچھے علاج اور اچھی غذا سے ٹھیک ہو گئی۔ ان کو جو بہت سا پیسہ ہمارے گھر سے ملا تھا اس سے انہوں نے اور ان کی لڑکی نے ترکاری کی دکان رکھ لی اور دو چار گھروں میں ان کی لڑکی جھاڑو پونچھے کا کام کرنے لگی۔ بچے بھی اس کا ہاتھ بٹانے لگے۔

لکھنؤ کے یہ ایک گھر کی کہانی نہیں ہے، یہ گھر گھر کی سخاوت کی کہانی ہے۔ سب لوگ ضرورت مند لوگوں کی مدد کرنے کے لیے تیار رہتے تھے۔ دعا ہے کہ اللہ ہر جگہ کے لوگوں کو اور سب کو ایسی توفیق دے۔ یہ صرف لکھنؤ کی ہی نہیں ہر جگہ کی

انسانیت کی داستان بن کر تہذیب کے سانچے میں ڈھل جائے۔ہم لوگوں کو لکھنؤ یا اس کی تہذیب کے بارے میں پتا بھی نہیں چلتا اگر اپنے گھر میں اور اپنے آس پاس نہیں دیکھتے۔رحم اور ہمدردی کے یہ خوبصورت احساسات ایک تہذیب بن گئے اور پوری دنیا پر چھا گئے۔

◆

لکھنؤ کی ایک خصوصیت جو مجھے بہت پسند تھی وہ یہ ہے کہ وہاں کسی کو چھوٹا بڑا یا امیر غریب نہیں پکارا جاتا تھا، اور نہ ہائی کلاس، مڈل کلاس اور لور کلاس میں فرق رکھا جاتا تھا، اور نہ ان کو یہ نام دیا جاتا تھا۔غریب ہوں یا امیر، شرفاء اور بزرگوں کی عزت کی جاتی تھی۔امیر غریب نہیں دیکھا جاتا تھا۔امیر غریب سب ایک دوسرے کے کام آتے تھے ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔غریب اپنے ہاتھ پیروں سے اپنی ہمدردی سے بڑے لوگوں کے کام آتے تھے۔ بڑے لوگ یا امیر لوگ اپنی ہمدردی، اپنے رسوخ اپنے پیسوں سے ان کے اور ایک دوسروں کے کام آتے تھے۔مساوات کی ایسی خوبصوت مثال سوائے لکھنؤ کے کہیں نہیں ملے گی۔ جب میں انڈیا جاتی تھی دھوبن جو گھر والوں کے کپڑے دھوتی تھیں اور دوسرے غریب گھروں کی خواتین جو مجھے بچپن سے جانتی تھیں، گھر کی بوائیں جن کو میں نے بچپن سے دیکھا ہوا تھا، اگر وہ ہمارے گھر میں کام کرتی ہوتی تھیں یا کام نہیں کر رہی ہوتی تھیں تب بھی وہ ملنے آتی تھیں اور بہت خوش ہوتی تھیں۔فوراً گلے سے لگاتی تھیں۔ مجھے بہت اچھا لگتا تھا کہ اتنے بہت سے لوگ میرے اپنے ہیں۔ میرے آنے کا انتظار کرتے ہیں۔ میرے آنے پر خوش ہوتے ہیں۔مساوات کی سب سے بڑی یہ مثال لکھنؤ میں دکھائی دیتی

تھی۔ میری نظر میں یہ ہی لکھنؤ کی اصلی تہذیب تھی جس میں نہ کوئی بڑا تھا نہ کوئی غریب یا حقیر تھا۔ سب کی اپنی عزت تھی۔ سب کی عزت کی جاتی تھی۔ ایک بار میں لکھنؤ گئی۔ میں کسی رشتہ دار سے ملنے گئی تھی جب وہاں سے واپس آئی اور جیسے ہی کار سے اتر کر گھر کے اندر جانے لگی تو میں نے دیکھا ایک دھوبن کو جن کو ہم سب بھابھی دھوبن کہتے تھے وہ اسی نام سے پہچانی جاتی تھیں۔ ان کی نند میرے گھر کے کپڑے دھوتی تھی مگر بھابھی دھوبن کو بھی ہم لوگ بچپن سے جانتے تھے۔ ان کا بھی ہمارے گھر آنا جانا تھا۔ تیوہار وغیرہ کے موقعہ پر وہ اور ان کے بچے تیوہاری لینے آتے تھے۔ اس دن بھابھی دھوبن دو تین آدمیوں کے بیچ کھڑی رو رہی تھیں اور کہہ رہی تھیں۔ ”میرے لڑکے نے دو تین دن سے مجھے کھانا نہیں دیا۔ میں بہت بھوکی ہوں، مجھے بہت بخار ہے۔ میرے پاس پیسے نہیں ہیں۔ اس وجہ سے نہ میں ڈاکٹر کو دکھا سکتی ہوں اور نہ کچھ کھا سکتی ہوں۔“ مجھے بہت ترس آیا۔ میں نے ان کو اشارے سے بلایا اور چپکے سے ان کے ہاتھوں میں روپے رکھ دیے اور کہا۔ ”کسی کو دکھانا نہیں۔“ وہ چلی گئیں۔ میری بہنیں پوچھتی رہیں کہ کتنا دیا، مگر میں نے نہیں بتایا۔ وہ عورت جن لوگوں سے بات کر رہی تھیں انہوں نے بھی پوچھا کہ کیا دیا ہے، مگر انہوں نے ان کو نہیں بتایا۔ رات کو بھائی آئے تو کہنے لگے۔ ”تم نے بھابھی دھوبن کے ساتھ کیا کر دیا ہے کہ وہ سڑک پر چیخ چیخ کر کہہ رہی ہے، اللہ میری امریکا والی بٹیا کو سلامت رکھے۔ ان کے بچوں کو سلامت رکھے۔ پوری سڑک ان کی دعاؤں سے گونج رہی ہے۔“ میں نے کہا۔ ”ان کے لڑکوں نے اُن کو دو تین دن سے کھانا نہیں دیا تھا۔ ان کو بخار تھا۔ ان کے پاس پیسے نہیں تھے کہ وہ کچھ کھاتیں یا ڈاکٹر کے پاس جاتیں۔ ان کے لیے کھانا اور ڈاکٹر کے پاس جانا بہت

ضروری تھا۔اس لیے میں نے ان کو کچھ پیسے دے دیے۔'' بھائی نے پوچھا۔'' کتنے پیسے دیے تھے؟'' میں نے کہا۔'' جو اس وقت میرے پاس تھے وہ میں نے دے دیے تھے۔'' دوسرے دن بھائی نے جا کر ان کے لڑکے کو خوب ڈانٹا۔'' تم لوگ خود کھانا کھا لیتے ہو اور اپنی ماں کو کھانا نہیں دیتے ہو۔ان کو بھوکا رکھتے ہو۔تم لوگ کھانا نہیں کھاتے ہو حرام کھاتے ہو۔ ہمارے مذہب میں ہے کہ اگر کوئی پڑوسی بھوکا ہو تو کھانا حرام ہوتا ہے اور تم ظالم انسان اپنی ماں کو بھوکا رکھتے ہو تو کتنے بڑے عذاب میں مبتلا ہو گے۔ یہ سوچا ہے۔''

یہ لکھنؤ کی تہذیب کی انوکھی دنیا جہاں ہر غریب شخص امیر اور غریب دونوں کا ہمدرد، جہاں امیر لوگ، امیر اور غریب دونوں کے ہمدرد۔ جہاں اچھے برے وقت پر سب ایک دوسرے کے ساتھ کندھے سے کندھا ملائے کھڑے دکھائی دیتے تھے۔ امیر ہو یا غریب سب ایک دوسرے کا خیال رکھتے تھے۔کسی بڑے گھر میں بھی اگر کسی کا انتقال ہو جاتا تھا تو سب سے پہلے غریب ہمدردی اور مدد کے لیے آتے تھے۔رشتہ دار اور امیر بعد میں آتے تھے۔کسی غریب کے یہاں کچھ ہو جاتا تھا تو سب امیر اس کی مدد کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے۔ یہ اصلی تہذیب تھی ہمارے لکھنؤ کی جو مساوات کا درس دیتی تھی۔ جس کو شاید ہی کوئی جانتا ہو جس کو میں نے دیکھا ہے اور لکھنؤ والوں نے دیکھا ہے۔ جہاں محمود و ایاز اب بھی زندہ تھے اور ایک ساتھ کھڑے اپنی عظمت کا پتہ دے رہے تھے۔

مجھے یاد ہے اور میں نے دیکھا ہے، ایک رکشے والے کو ہاتھ جوڑ کر لکھنؤ کی تہذیب کی شان میں قصیدہ پڑھتے ہوئے۔ اتفاق سے یہ واقعہ بھی مجھ سے ہی وابستہ

ہے۔ایک بار جب ہم لوگ نویں کلاس میں تھے میں اور میری چھوٹی بہن اپنی دوست کے گھر جارہے تھے۔ بڑی مشکل سے ایک رکشہ ملا۔اس جگہ کے لیے جہاں مجھے جانا تھا۔ رکشے والا بہت زیادہ پیسے مانگ رہا تھا۔کافی بحث کے بعد وہ اتنے پیسوں پر راضی ہوا جواس جگہ کا کرایہ تھا۔ ہمارا ادھر بہت آنا جانا تھا اس لیے ہم ریٹ خراب نہیں کرنا چاہتے تھے اور کرایہ بڑھانا نہیں چاہتے تھے۔ہم لوگ جارہے تھے۔راستے میں اچانک لوہے کی سریاں لے کر جاتے ہوئے ایک ٹھیلے سے رکشے کی ٹکر ہوگئی۔ہم لوگ بال بال بچے مگر رکشے والا ہم لوگوں کو بچانے کے چکر میں خود زخمی ہوگیا۔اس کے پیر میں لوہا لگ گیا۔ہم لوگ ڈر گئے۔ کیونکہ ایک مہینہ پہلے ہم لوگ اسکول کی طرف سے پکنک پر گئے تھے وہاں ہماری ایک کلاس فیلو کی چپل میں لگی کیل چبھ گئی تھی۔اس کی چپل ٹوٹ گئی تھی۔اس نے موچی کو بنوانے کے لیے دی تھی۔اس نے کیل لگا کر چپل جوڑ دی تھی۔اس لڑکی کو ٹیٹنس ہوگیا تھا اور اس کا انتقال ہوگیا تھا۔ یہ بہت دردناک واقعہ تھا۔ ہم دونوں بہنوں کو وہ واقعہ یاد آ گیا۔ہم لوگوں کو بہت افسوس ہورہا تھا۔ رکشے والے کو اگر ٹیٹنیس ہوگیا تو اس کے اہل خانہ کا کیا ہوگا۔ پتہ نہیں کتنا بڑا خاندان ہوگا۔ بے چارہ اکیلا کمانے والا ہوگا وغیرہ وغیرہ۔سہیلی کا گھر قریب تھا وہاں پہنچ کر ہم دونوں کے پرس میں جتنے روپے تھے وہ سب اس رکشے والے کو دے دیا اور کہا۔ ''پرائیوٹ ڈاکٹر کے پاس جاکر فوراً ٹیٹنیس کا ٹیکا لگواؤ۔ اگر ایک دو دن تم کو اور تمھارے گھر والوں کو بھوکا رہنا پڑے تو رہ لینا مگر ان پیسوں سے ٹیکا ضرور لگوالینا۔دو ایک وقت کھانا نہ کھانے سے بھی سب لوگ زندہ رہیں گے لیکن اگر ٹیٹنیس ہوگیا تو اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔'' وہ رکشے والا تھوڑا بہت پڑھا لکھا بھی تھا۔کسی دوسری جگہ

سے آیا تھا۔ اس کو نوکری نہیں ملی تھی اس لیے رکشہ چلا رہا تھا۔ ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”کیا لکھنؤ کی شان اور تہذیب ہے۔ اپنے گاؤں میں جیسا لکھنؤ کے بارے میں سنا تھا ویسا ہی پایا۔ جو بٹیا لوگ ذرا سے زیادہ کرائے پر بحث کر رہی تھیں، پچیس پیسے زیادہ دینے کو تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے اپنے پورے پیسے اس غریب کو دے دیا کہ کہیں لوہا لگنے سے مجھے ٹیٹنیس نہ ہو جائے میرے گھر والے بے سہارا نہ ہو جائیں۔ بغیر کسی جان پہچان کے اتنی انسانیت اتنی بڑائی جو لکھنؤ کی سنی تھی وہ دیکھ لی۔ لکھنؤ کی تہذیب کی جے ہو۔“

رکشے والے کے واقعہ پر یاد آیا کہ ایک بار میں علی گڑھ گئی۔ لکھنؤ سے پہلی بار نکلی تھی۔ مجھے اپنی دوست سے ملنے جانا تھا۔ میرے رشتہ دار کہنے لگے کہ ہم تم لوگوں کو کار سے چھوڑ دیں گے مگر میں نے اور میری بہن نے کہا۔ ”ہم لوگ شہر دیکھنا چاہتے ہیں۔ رکشے سے چلے جائیں گے۔“ باہر سڑک پر بہت بھیڑ تھی۔ رکشے والوں کے مزاج نہیں مل رہے تھے۔ رکشے والے رکتے مگر یہ کہتے کہ آنا نہ جانا کہہ کر چلے جاتے۔ ہم لوگ ان کے برتاؤ سے ڈر رہے تھے۔ ایک رکشے والا بولا جانا ہے تو بیٹھو نہیں جانا تو جاؤ۔ ہم لوگ جلدی سے بیٹھ گئے۔ جب دوست کے یہاں پہنچے تو کہا۔ ”یہاں کے رکشے والے کتنے بدتمیز ہیں۔ عجیب طرح سے بات کر رہے تھے۔“ یہ سن کر وہاں سب لوگ بہت ہنسے اور کہا۔ ”رکشے والے بدتمیز نہیں تھے۔ ان کی زبان ایسی ہے۔ آپ کو لکھنؤ کے رکشے والوں کی زبان سننے کی عادت ہے، اس لیے ان کی زبان کی وجہ سے آپ لوگوں کو ان کا برتاؤ الگ لگ اور برا لگ رہا تھا۔“ واقعی میں لکھنؤ کے رکشے والوں، تانگے والوں اور یکے والوں کی زبان، رکھ رکھاؤ سے بھی وہاں کی تہذیب کا پتا چلتا تھا۔

جب میں چھوٹی تھی کبھی کبھی جب گھر کے بڑوں کے ساتھ ہم سب لوگ جاتے تھے سب بچے تانگہ یا یکہ پر بیٹھنے کی ضد کرتے تھے۔ جب تانگہ یا یکے پر بیٹھتے تو تانگے یکے والے لکھنؤ کی کہانیاں سناتے ہوئے چلتے تھے۔ یہ بات ہم بچوں اور بڑوں کو بہت اچھی لگتی تھی۔ جہاں جہاں سے تانگہ گزرتا تھا اس جگہ کی کوئی نہ کوئی تاریخ یا کہانی ان کے پاس ہوتی تھی۔ وہ بتاتے چلتے تھے اور بتانے کا طریقہ اور لہجہ بہت زبردست ہوتا تھا۔ لکھنؤ والے ہوکر بھی ہم لوگ بہت شوق سے سنتے تھے۔ کوئی بور نہیں ہوتا تھا۔ لمبا راستہ بہت اچھی طرح سے کٹ جاتا تھا۔ لکھنؤ کے نوابوں، لکھنؤ کی تہذیب اور زبان کا پتا بھی چل جاتا تھا۔ ایک بار میں لکھنؤ گئی۔ میرے تین سال کے بیٹے کو رکشہ بہت پسند آیا۔ جب میں اپنی منزل پر پہنچ گئی تو بچہ خود ہی رکشے سے اترنے کی کوشش کرنے لگا۔ تو رکشے والے نے کہا۔ ''میاں صاحبزادے آپ بہت چھوٹے ہیں، خود سے نہیں اتر پائیں گے۔ آیئے حضور میں آپ کو اتار دوں۔'' اس نے بچے کو بہت پیار سے نیچے اتار دیا۔ مجھے اس کی زبان اور اس کا مہذب انداز بہت پسند آیا۔ میں نے رکشے کا پچاس روپے کرایہ دیا اور خوش ہوکر سو روپے اور دے دیے اور کہا۔ ''آپ کی زبان اور اس کا مہذب انداز مجھے بہت پسند آیا۔ آپ نے ہمارے لکھنؤ کی تہذیب اور ہماری خوبصورت زبان کو زندہ رکھا۔ یہ دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ ان پیسوں سے ہم لوگوں کی طرف سے چائے پی لیجیے گا۔'' ہم لکھنؤ سے باہر رہ کر لکھنؤ اور اس کی تہذیب کے بارے میں اتنا سن کر آ رہے تھے کہ واقعی مجھے وہ رکشے والا اپنے کندھوں پر لکھنؤ کی تہذیب اور مہذب زبان کا بوجھ اٹھائے ہوئے ایک عظیم انسان لگا۔

◆

میری دوست منجو کا گھر اسکول سے بہت قریب تھا۔ وہ پیدل آتی جاتی تھی۔

میرا گھر اسکول سے بہت دور تھا تو میں رکشے پر آتی جاتی تھی۔ ہم لوگ پانچویں کلاس میں پڑھتے تھے۔ میری دوست کا گھر راستے میں پڑتا تھا۔ کبھی کبھی میں اپنے رکشے پر بٹھا کر اس کو اس کے گھر چھوڑ دیتی تھی۔ ایک بار میں اس کو اس کے گھر چھوڑنے گئی تو مونگ پھلی والا آواز لگا رہا تھا۔ میری دوست نے کہا۔ ''اس مونگ پھلی والے کی مونگ پھلی بہت اچھی ہوتی ہیں۔'' یہ کہہ کر مونگ پھلی والے کو روک لیا اور مجھ سے کہا۔ ''تم بھی آؤ میں گھر سے پیسے لے کر آتی ہوں۔ ہم دونوں مونگ پھلی کھائیں گے۔'' میں راضی ہوگئی اور رکشے سے اتر گئی۔ وہ جلدی سے اپنے گھر کے اندر گئی اور پیسے لے کر آگئی۔ مونگ پھلی والا مونگ پھلی بہت دھیرے دھیرے تولنے لگا تو میری سہیلی جو کسی دوسرے شہر سے آئی تھی اور لکھنؤ میں نئی نئی تھی، اس نے رکشے والے سے کہا۔ ''اماں یار جلدی کرو میری دوست کو دیر ہو رہی ہے۔'' مونگ پھلی والا جلدی سے بولا۔ ''بٹیا صاحب آپ بڑے گھر کی ہیں۔ بڑے گھر کی لڑکیاں یار نہیں بولتی ہیں۔ ہمارے لکھنؤ میں برا سمجھا جاتا ہے۔'' مونگ پھلی والے کی سکھائی یہ تہذیب، یہ بات میں کبھی نہیں بھولی۔ ہوسکتا ہے کہ اپنی دوست کے ساتھ رہتے رہتے میں بھی یار لفظ بولنے لگتی۔ ویسے میں نے اپنے آس پاس غور کیا تو واقعی میں عورتیں اور لڑکیاں یار نہیں بولتی تھیں۔ اپنے گھر یا اسکول یا کہیں بھی عورتوں اور لڑکیوں کو ایک دوسرے کو یار کہتے نہ کبھی سنا تھا اور نہ خود کبھی بولا تھا۔ آدمی لوگ اپنے دوستوں سے اماں یار بولتے تھے۔ اب تو فلموں وغیرہ کی وجہ سے لکھنؤ کی لڑکیوں میں بھی یہ لفظ بہت عام ہو گیا ہے۔

تیوہاروں اور اپنے خاص خاص موقعوں پر لکھنؤ والے ایک دوسرے کو حصّہ بھیجتے تھے۔ تیوہاروں میں بننے والی خاص ڈشیں، مٹھائی، یا کسی کی شادی طئے ہونے کی

مٹھائی، بچے کی پیدائش کی مٹھائی، مجلس، میلاد یا پوجا کا تبرک، کرسمس کا کیک۔ عام دنوں میں بنی گھر کی کوئی خاص چیز وغیرہ جو بھی بھیجا جاتا تھا اس کو حصّہ کہا جاتا تھا۔ گھروں کے نوکر یا خود گھروں کے بڑے یا بچے ایک سینی یا ٹرے میں قلعی کیے ہوئے شاندار برتنوں میں یا بہت عمدہ اور شاندار چینی کے برتنوں میں بہت خوبصورت خوان پوش سے ڈھکے ہوئے حصّے گھر گھر لے جاتے تھے۔ امیر ہی نہیں غریب لوگ بھی ایسے ہی شاندار طریقے سے گھر گھر حصّہ بھیجتے تھے۔ کبھی کبھی وہ برتن رکھ لیے جاتے تھے خالی برتن واپس کرنا معیوب سمجھا جاتا تھا۔ کوئی چیز پکا کر یا بازار سے منگوا کر برتن واپس کیے جاتے تھے۔ تہذیب کا یہ کردار یا نمونہ ہم لوگوں کو بہت پسند تھا۔ سب لوگ خوش ہوتے تھے کہ کہیں سے مزے دار چیز آئی ہے، وہ کھانے کو ملے گی اور برتنوں کو واپس بھیجنے پر کوئی مزے دار چیز گھر میں بنے گی یا بازار سے آئے گی۔ یہ بھی لکھنؤ کی ایک ایسی تہذیب تھی جو مجھے بہت پسند تھی اور ہمیشہ یاد رہتی ہے۔

مجھے اپنی چھٹی کلاس کا ایک واقعہ یاد آ گیا۔ ایک دن ہماری انگلش ٹیچر وکٹوریہ میڈم نے کلاس سے پوچھا۔ ’’جب آپ لوگ لڑتی ہیں تو لڑائی میں آپ، تم اور تُو میں کون سا لفظ استعمال کرتیں ہیں؟‘‘ لکھنؤ سے باہر سے آئی ہوئی ہوسٹل کی سب لڑکیوں نے کہا۔ ’’ہم لوگ لڑائی میں تُو کا لفظ استعمال کرتے ہیں۔‘‘ ٹیچر وکٹوریہ میڈم نے کہا۔ ’’بہت شرم کی بات ہے جب آپ لڑتی ہیں تو ایک دوسرے کو تُو کہتی ہیں۔ ہم لوگ تو لڑائی میں تم کا استعمال بھی نہیں کرتے۔ لڑتے وقت ایک دوسرے کو آپ کہنے لگتے ہیں۔ یہاں تک میرے چار پانچ سال کے بچے جب آپس میں لڑتے ہیں تو تم کہنے کے بجائے ایک دوسرے کو آپ کہنے لگتے ہیں۔ تُو کہنے کا تو سوال ہی نہیں اٹھتا

ہے۔‘‘ یہ بات وکٹوریہ میڈم نے ٹھیک کہی تھی۔لکھنؤ کی لڑکیوں نے ان کی اس بات پر تالی بجادی۔ واقعی میں لکھنؤ میں جب دو بہنیں، دو دوستیں، میاں بیوی، دو دشمن وغیرہ جو بھی لوگ لڑتے تھے وہ ایک دوسرے کو آپ کہنے لگتے تھے۔ تُو تو بہت دور کی بات ہے تم بھی نہیں کہتے تھے۔لڑائی میں کبھی بھی تُو کا استعمال نہیں کرتے تھے۔اب کیا حال ہے میں نہیں بتا سکتی۔لکھنؤ میں بڑے بھی چھوٹوں سے آپ سے بات کرتے تھے۔ اسکول میں ٹیچرز طالبات یا طالب علموں سے آپ سے بات کرتی تھیں یا کرتے تھے۔ چھوٹے تو ہر جگہ بڑوں سے آپ سے بات کرتے ہیں۔ یہ لکھنؤ کی خصوصیت ہے جہاں بڑے چھوٹوں سے آپ سے بات کرتے ہیں۔لکھنؤ کی اس تہذیب کو اب پوری دنیا کے بہت سے لوگوں نے اپنا لیا ہے۔ اسکولوں میں لڑکیاں اور لڑکے اپنی ٹیچرز کی بہت عزت کرتے تھے۔ ہم لوگ اپنی دوستوں کے ساتھ کلاس کے باہر بیٹھے ہوتے اور اگر ادھر سے کوئی استانی صاحبہ گزرتیں تو ہم لوگ کھڑے ہو جاتے۔ اگر وہ بہت سی کتابیں اٹھائے ہوتیں تو فوراً ان کی مدد کرتے اور ان کی کتابیں خود پکڑ کر اسٹاف روم تک پہنچاتے۔ کیا طریقہ کیا تہذیب سکھائی گئی تھی۔ سکھانے والوں کو سلام۔ گھر میں اگر ہم لوگ لیٹے ہوتے اور کوئی بڑا آجاتا تو فوراً اٹھ کر بیٹھ جاتے۔ بڑوں یا بزرگوں کے سامنے لیٹے رہنا بدتمیزی یا بدتہذیبی کہلاتی تھی۔ اگر چار چھ لوگ ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو صرف دو لوگوں کا بات کرنا اچھا نہیں سمجھا جاتا تھا۔ بات چیت میں ایک جگہ بیٹھے سب لوگوں کو شامل کیا جاتا تھا۔ یہ خیال رکھا جاتا تھا کہ دو لوگوں کی گفتگو سے کوئی تیسرا شخص اور دوسرے لوگ جو ساتھ میں بیٹھے ہیں وہ نظر انداز یا بور نہ ہوں۔ یہ بات میں نے صرف لکھنؤ میں دیکھی ہے۔ مجھے یاد ہے کہ آٹھویں کلاس میں

میرا آٹھ لڑکیوں کا گروپ تھا جن میں بہت دوستی تھی۔ دو بینگالی تھیں۔ دو پنجابی تھیں۔ دو ہندو اور ہم دو مسلم دوستیں لکھنؤ کی تھیں۔ ہمیشہ بینگالی لڑکیاں بینگالی میں بات کرنے لگتی تھیں۔ لکھنؤ میں بینگالیوں کے لیے مشہور تھا کہ جب دو بینگالی ملتے ہیں تو آپس میں بینگالی بولتے ہیں۔ ان بینگالی لڑکیوں کو دیکھ کر دونوں پنجابی دوستیں پنجابی میں بات کرنے لگتیں۔ ہم چاروں لکھنؤ والی دوستیں چپ چاپ کھڑے ان کا منھ تکتے تھے کیونکہ ہم لکھنؤ والے اس وقت بینگالی اور پنجابی نہیں سمجھتے تھے۔ بعد میں انہیں دوستوں کی بدولت یہ زبانیں آگئیں۔ ہم لوگ آپس میں بات نہیں کرتے تھے کیونکہ وہ چاروں ہم لوگوں کی زبان سمجھتی تھیں تو ہماری بات چیت بھی سمجھتیں اور ہم لوگوں کی طرح بور نہیں ہوتیں بلکہ گفتگو میں حصہ لیتیں جو ہم نہیں چاہتے تھے۔ ہم دو لوگ ان کی طرح کسی اور زبان میں بات کر کے ان کو بھی بور کرنا چاہتے تھے جیسا وہ اپنی زبان میں باتیں کر کے ہم لوگوں کو بور کرتی تھیں، مگر ہمارے پاس ایسی کوئی زبان نہیں تھی جو وہ نہ سمجھ سکیں۔ انگریزی اردو اور ہندی ہم لوگوں کو آتیں تھیں۔ وہ ان کو بھی آتیں تھیں۔ میں اور میری مسلم دوست عربی کے کلاس میں جاتے تھے۔ گھر پر بھی قرآن شریف پڑھایا جاتا تھا۔ بہت سی سورت یاد کروائی جاتی تھیں۔ ہم دونوں مسلم دوستوں نے سوچا جب یہ چاروں اپنی اپنی زبان میں بات کریں گی تو جتنی عربی کلاس میں عربی زبان سیکھی ہے وہ عربی بولیں اور ساتھ میں ہم لوگ سورت پڑھیں اور ایسا ظاہر کریں جیسے عربی میں بات کر رہے ہیں۔ دوسرے دن ہم لوگوں نے ایسے ہی کیا۔ سیکھی ہوئی عربی کے الفاظ کے ساتھ ساتھ میری دوست ایک لائن سورت کی پڑھتی میں دوسری لائن پڑھتی۔ وہ دوسری لائن اور آگے کی پڑھتی یا دوسری سورت پڑھتی تو میں اس کے

آگے کا پڑھتی یا دوسری سورت پڑھتی۔ہم دونوں ایسا ظاہر کرتے جیسے فرّاٹے سے عربی زبان میں بات کرر ہے ہیں۔اب ان چھ لوگوں کے بور ہونے کا وقت تھا۔ان میں سے ایک ہندو دوست نے اپنے گھر پر جا کر کہا کہ ہمارا آٹھ سہیلیوں کا گروپ ہے۔ پہلے چار لڑکیاں اپنی زبان پنجابی اور بینگالی میں بات کرتی تھیں جو ہماری سمجھ میں نہیں آتی تھی تو ہم لوگ بور ہوتے تھے اور ان کا منہ تکتے تھے۔دو مسلم لڑکیاں تھیں وہ اچانک فرّاٹے سے عربی بولنے لگیں۔ان کے والد صاحب کی مسلمانوں سے دوستی تھی۔وہ خوب ہنسے اور انہوں نے کہا۔’’وہ عربی نہیں بولتیں ہیں قرآن شریف ان کو یاد کروایا جاتا ہے وہ تم کو نہیں ان چاروں کو چڑھانے کے لیے یاد کیا ہوا قرآن شریف پڑھتی ہیں۔ان کو ان کے معنی خود بھی نہیں معلوم ہوں گے کہ وہ کیا پڑھ رہی ہیں۔‘‘ دوسرے دن جیسے ہی ان چاروں نے اپنی زبان میں بات شروع کی ہم دونوں نے عربی میں بات کرنا شروع کر دیا۔فوراً میری وہ ہندو دوست بولی۔’’تم لوگوں کو عربی نہیں آتی ہے۔تم لوگ ان لوگوں کو چڑھانے کے لیے یاد کیا ہوا قرآن شریف پڑھتی ہو جس کے معنے تم خود بھی نہیں جانتی ہو یا ہوسکتا ہے کہ تھوڑے بہت معنے جانتی ہو۔ہم کو تمھارے کچھ جملے یاد ہو گئے تھے۔وہ ہم نے اپنے پاپا کو سنایا تو وہ خوب ہنسے اور انہوں نے بتایا کہ تم لوگ یاد کیا ہوا قرآن شریف پڑھتی ہو یا عربی کلاس کے یاد کیے ہوئے جملے پڑھتی ہو۔ہم لکھنؤ والے ہیں ہمارے پاس اردو اور ہندی کے علاوہ کوئی دوسری زبان نہیں ہے جس میں ہم لوگ دوسروں کو بور کرنے کے لیے ایک دوسرے سے بات کریں۔ہم آٹھوں دوستیں ہیں تو جب ہم آپس میں ملا کریں تو اپنی دوستی نبھانے کے لیے اپنی لکھنؤ کی زبان میں بات کریں جو سب کو آتی ہے تو زیادہ اچھا ہے،

تب ہی ہم لوگوں کو ایک دوسرے کی دوستی میں مزہ آئے گا۔‘‘

اس دن سے ہم لوگ پھر سے دوست ہو گئے اور ہماری ختم ہوتی دوستی پھر سے پہلے جیسی ہو گئی۔ لکھنؤ کی یہ چیز مجھے بہت پسند تھی کہ اگر کئی لوگ ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو بات چیت کرتے وقت ایک دوسرے کو شامل رکھا جاتا تھا۔ میری دوستوں کی الگ الگ زبانیں تھیں جس میں وہ بات کرتی تھیں اور پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگ کتنا برا محسوس کرتے تھے۔ یہ ہی نہیں ایک ہی زبان بولتے ہوئے بھی پاس بیٹھے ہوئے دوسرے لوگوں کو اگنور کر دینا اور صرف دو لوگ آپس میں بات چیت کرتے رہیں تو یہ بات لکھنؤ میں بدتہذیبی کہلاتی تھی۔ جب کہ پوری دنیا میں ایسا ہی دکھائی دے گا دو چار لوگوں کے گروپ میں ہونے کے باوجود دو لوگ آپس میں ہی بات کرتے ہوئے ملیں گے اور زبان بھی مختلف نہیں ہوتی ہے۔ وہ دوسروں کو بھی آتی ہے۔ ان کے ساتھ بیٹھے ہوئے ان کے دوست یا دوسرے لوگ اپنے کو اگنور اور بور ہوتا ہوا محسوس کرتے ہیں مگر ان پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔ لکھنؤ میں اگر بہت سے لوگ ایک ساتھ بیٹھے ہیں تو سب کو گفتگو میں شامل کیا جاتا تھا۔ اس کو آداب محفل کہا جاتا تھا۔ لکھنؤ میں کسی محفل یا گروپ میں بیٹھ کر ایک دوسرے کے کان میں بات کرنا آداب محفل اور تہذیب کے خلاف سمجھا جاتا تھا۔ ایک دوسرے سے بات کر رہے ہوتے اور کوئی اور آ جاتا تو اپنی باتوں میں مگن نہیں رہا جاتا تھا، اس کا خیر مقدم کیا جاتا تھا۔ ان باتوں پر کون غور کرتا ہے۔ یہ سب باتیں تو عام ہیں۔ لیکن یہ باتیں اگر کسی لکھنؤ والے میں دکھائی دیتیں ہیں تو سب کو متأثر کرتی ہیں۔ تہذیب کے لبادے میں لپٹ جاتی ہیں۔

◆

کچھ اور قصے اور واقعات ایسے ہیں جن سے صرف لطف یا انجوائمنٹ وابستہ ہے۔تہذیب وتمدن کے ساتھ مزاح بھی شامل رہتا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ جب میں گیارہویں کلاس میں تھی۔ میری آنکھوں میں تکلیف تھی اور میری سہیلی کو اپنی آنکھیں ٹیسٹ کروانی تھیں۔ جب اس نے سنا کہ میں اپنے ماموں جان کے ساتھ آنکھیں دکھانے جارہی ہوں تو اس نے کہا وہ بھی ساتھ چلے گی۔ ماموں جان ہم دونوں کو اپنے ساتھ لے گئے۔ڈاکٹر ان کی جان پہچان کے تھے۔اس وقت ہم دونوں گیارہویں کلاس میں تھے مگر دیکھنے میں ساتویں آٹھویں کلاس کے لگتے تھے۔لکھنؤ والے بہت اخلاق کے ہوتے ہیں۔اپنے پاس بیٹھی دو چھوٹی چھوٹی لڑکیوں یا لڑکوں سے بات ضرور کرتے تھے۔جب تک ہم لوگوں کا نمبر آتا پاس بیٹھی عورتیں آدمی بات کرنے لگتے تھے اور سب سے پہلے کلاس پوچھتے تھے۔کبھی کبھی خود ہی بہت چھوٹے کلاس کا گیس کر لیتے تھے۔تو کلاس پوچھنے کے بجائے دوسرے سوالات کرنے لگتے تھے۔اس وقت اجنبیوں کے سوالات اور جوابات سے ہم دونوں بہت بور ہو رہے تھے مگر جواب دینا پڑ رہا تھا۔اگر ان کے سوالات کے جواب نہ دیتے تو بدتمیزی یا بدتہذیبی کہلاتی۔ ہم کو دوسرے دن پھر جانا تھا۔ اس دن ہم دونوں نے طئے کیا اب اگر کوئی کلاس پوچھے گا تو کہہ دیں گے ایم اے کر چکے ہیں،تو اجنبی خواتین اور آدمی لوگ بات نہیں کریں گے۔ان کے پاس بات کرنے کا موضوع ختم ہو جائے گا اور بڑی لڑکیاں اور بہت زیادہ تعلیم یافتہ سمجھ کر بیکار میں بات چیت کا نہ آغاز ہوگا اور نہ ہمیں بیزار ہونا پڑے گا۔ ماموں ہم دونوں کو کلینک میں چھوڑ کر کسی کام سے چلے گئے۔ڈاکٹر صاحب جان پہچان کے تھے۔کلینک میں بہت بھیڑ تھی۔ ہم لوگ بیٹھ گئے۔ پاس بیٹھے لوگوں

نے پہلے کی طرح باتیں کرنا شروع کردی۔ اتفاق سے پہلا سوال کلاس ہی پوچھا گیا۔ جیسے ہی انہوں نے کلاس پوچھا ہم دونوں نے کہہ دیا کہ ہم لوگ ایم اے کر چکے ہیں۔ بات وہیں پر ختم ہوگئی، آگے نہیں بڑھی۔ ہم دونو ں نے اپنی اس ترکیب پر ایک دوسرے کو داد دی۔ اتنے میں ایک صاحب آ کر بیٹھ گئے۔ آتے ہی انہوں نے بھی بات چیت شروع کردی۔ وہی پہلا سوال کون سی کلاس میں ہو؟ ہم دونوں نے فوراً کہا۔ ''ایم اے کر چکے ہیں۔''

وہ صاحب حیرت سے اچھل پڑے اور پوچھا۔ ''ایم اے کرلیا۔ کب کیا؟''

''اسی سال کیا ہے۔'' ہم دونوں نے جواب دیا۔

ہم دونوں دیکھنے میں اتنے چھوٹے لگتے تھے کہ بہت زیادہ سال نہیں بتا سکتے تھے۔ ہم لوگ سمجھے کہ اوروں کی طرح مطمئن ہو کر وہ صاحب بھی بیٹھ جائیں گے۔ مگر انہوں نے تو سوالات کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور پوچھا۔ ''کس مضمون میں ایم اے کیا ہے؟''

ہم لوگ اس سوال کے لیے تیار نہیں تھے۔ میں نے گیارہویں کلاس میں نیا مضمون سیکالجی لیا تھا اس لیے جلدی سے کہہ دیا۔ ''سیکالجی میں ایم اے کیا ہے۔''

میری دوست کا پسندیدہ مضمون جغرافیہ تھا اس نے کہہ دیا۔ ''میں نے جغرافیہ میں ایم اے کیا ہے۔''

پھر سوال پوچھا گیا۔ ''کہاں سے کیا ہے؟''

ہم نے جواب دیا۔ ''یہیں سے، لکھنؤ یونیورسٹی سے۔''

انہوں نے کہا۔ ''لکھنؤ یونیورسٹی میں ایم اے میں جغرافیہ نہیں ہے اور میں

سیکالجی کا ہیڈ آف دی ڈیپاٹمنٹ ہوں۔‘‘

ہم دونوں حیران رہ گئے۔ کبھی نہ کبھی جھوٹ بولا وہ بھی پکڑا گیا۔ اتنے میں ماموں جان آگئے۔ ماموں جان اور وہ صاحب ایک دوسرے کو دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ دونوں ایک دوسرے کو بہت اچھی طرح جانتے تھے۔ وہ صاحب مزے لے لے کر ہمارے جھوٹ کا واقعہ سنانے لگے۔ ماموں جان کو پہلے تو برا لگا لیکن جب وجہ معلوم ہوئی تو وہ دونوں مل کر ہنسنے لگے اور ان صاحب نے کہا۔ ’’آپ دونوں نے بہت اچھی ترکیب نکالی دوسروں سے بات نہ کرنے اور ان کے سوالات کا جواب نہ دینے کی مگر ایم اے پاس سن کر بھی میں آپ دونوں سے سوالات کرتا چلا گیا۔ مجھ سے گستاخی ہوگئی معاف کیجیے گا۔‘‘ وہ خالص لکھنوی انداز میں ہمارے مذاق کا مذاق اڑانے لگے۔ انہوں نے اس میں مزاح کا پہلو نکال لیا تھا۔

◆

مجھے یاد ہے وہ لکھنؤ کی تہذیب جو نیکی میں ڈھلی بہت اعلیٰ تھی۔ وہ نئے ابھرتے لیڈر کی سیاست تھی۔ اگر سیاست بھی تھی تو بہت ہی قابل تعریف قابل قدر تھی۔ یہ سیاست ہر سیاستداں کو پیچھے بہت پیچھے چھوڑ گئی اور ان صاحبہ کو عظیم سیاستداں بنا کر اس وقت کی ان دبلی پتلی لمبے بالوں والی دوشیزہ کو آگے بہت آگے لے گئی۔ میں ایک بار اپنی بہن کے یہاں رکشے سے جا رہی تھی۔ اسکوٹر پر دو لڑکے بیٹھے ہوئے تھے۔ جو لڑکا اسکوٹر چلا رہا تھا وہ بہت تیز اسکوٹر چلا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ سے اسکوٹر پھسل گیا اور رکشے سے ٹکرا گیا۔ رکشے والا رکشہ سنبھالتا رہا۔ رکشے کا ہڈ ایک دم سے ٹوٹ کر نیچے کی طرف آنے لگا۔ میں اگر ہمت کر کے اس پر سے چھلانگ نہ لگا دیتی تو شاید رکشے

میں دب جاتی۔ میں نے سائڈ واک پر چھلانگ لگائی جہاں کنسٹرکشن کا کام ہو رہا تھا۔ بہت سے ٹوٹے پتھروں کے ڈھیر پڑے تھے میں اس ڈھیر پر جا کر گری۔ میرے پیر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ بہت زیادہ تکلیف کے باوجود میں خاموش تھی۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں کیا کروں۔ کیونکہ میں کسی سہارے کے بغیر اٹھ نہیں سکتی تھی۔ اُس وقت موبائل فون بھی نہیں تھے۔ بہت بھیڑ جمع ہوگئی۔ بھیڑ میں کوئی عورت نہیں تھی صرف آدمی لوگ تھے۔ وہ لکھنؤ کے مہذب لوگ تھے۔ کچھ نے اپنا ہاتھ بڑھایا کہ شاید میں ان کا ہاتھ پکڑ کر اٹھ جاؤں۔ مگر ہاتھ کے سہارے اٹھنا ممکن نہیں تھا۔ جب تک کوئی کمر سے پکڑ کر نہ اٹھاتا۔ حادثے کی جگہ کی سڑک کے دوسری طرف لائن سے کانگریس، بہوجن سماج پارٹی، سماج وادی پارٹی، بھارتی جنتا پارٹی، جنتا پارٹی اور کمیونسٹ پارٹی وغیرہ کے آفس تھے۔ اتنے میں بھیڑ کو ہٹاتی ایک خاتون اپنے ساتھیوں کے ساتھ آئیں جن کا تعلق سیاست سے تھا اور وہ اپنی پارٹی کی لیڈر تھیں۔ ابھی نئی نئی سیاست میں آئیں تھیں اور زیادہ مشہور نہیں تھیں۔ مجھے اٹھانے کے لیے اپنا ہاتھ بڑھایا اور کمر سے پکڑ کر مجھے اٹھالیا اور سہارا دیتی ہوئی اپنی وین کی طرف لے گئیں۔ ان کے پیچھے ان کے ساتھ کام کرنے والے ورکرز بھی تھے۔ وین میں بٹھا کر مجھے میری بہن کے گھر لے گئیں جو زیادہ دور نہیں تھا۔ میں ان کو نہیں جانتی تھی اس لیے میں نے ان کا نام پوچھ لیا۔ ان کا یہ احسان یہ نیکی میں نہیں بھولی اور نہ کبھی بھولوں گی۔ اگر وہ لیڈی اس وقت میری مدد نہ کرتیں تو میرا کیا ہوتا؟ میں اپنی اس کتاب میں ان عظیم لیڈی کا ذکر کر کے ان کو خراج عقیدت پیش کر رہی ہوں۔ میں اور میرے گھر والے ان کی نیکی کو کبھی نہیں بھولے۔ میرے پیر میں فریکچر تھا۔ پلاسٹر لگا تھا۔ میری فیملی بھی بہت پاپولر، بہت خاص

اور مشہور تھی۔ لکھنؤ ہی نہیں آس پاس کے شہروں کے لوگ بھی جانتے تھے۔ خود میری بھی ہندو، مسلم، سکھ، عیسائی دوستیں تھیں اور مجھے بھی بہت سے لوگ اور لکھنؤ کے خاندان جانتے تھے۔ روزانہ مجھے بہت سی خواتین اپنے اہل خانہ کے ساتھ دیکھنے آتی تھیں۔ سب لوگ افسوس کرتے تھے کہ میں انڈیا آئی اور ایکسیڈنٹ کروا بیٹھی۔ ساتھ میں ان خاتون کا نام اور ان کی ہمدردی اور نیکی کی کہانی گھر گھر پہنچ رہی تھی۔ ان کی شہرت ایک شہر سے دوسرے شہر تک پہنچ گئی۔ میں بڑھ چڑھ کر ان کی تعریفوں کے پُل باندھتی تھی۔ میرے گھر کے لوگوں کا بھی سیاست میں الیکشن میں دخل تھا۔ بغیر سامنے آئے ہم لوگ ان صاحبہ کو عروج پر دیکھنا چاہتے تھے۔ ان کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھنا چاہتے تھے۔ پھر میرے ایکسیڈنٹ کا واقعہ تو غائب ہو گیا مگر میرا اور میرے گھر والوں کا بنایا ہوا ان خاتون کا عظیم الشان خاکہ اُن خاتون کی بہترین خاتون کی شہرت کا ضامن بن کر پھیل گیا۔ سب نے کہا کہ اتنی عظیم خاتون کے ہاتھوں میں حکومت کی باگ ڈور ہونی چاہیے۔ یہ کام ان کے بینرز یا ورکرز اتنا نہیں کر سکے جتنا ان کی نیکی اور ہمدردی نے کیا تھا۔ اللہ نے ان کی بے غرض نیکی کا اچھا اجر دیا۔ وہ بہت عروج پر پہنچیں۔ برسوں ان کا عروج قائم رہا۔ مجھے ان کا عروج دیکھ کر بہت خوشی ہوتی تھی۔ لکھنؤ کی یہ دو خواتین کی کہانی ہے۔ کہا جاتا ہے نیکی رائیگاں نہیں جاتی۔ پتا نہیں جس سے نیکی کی جائے اللہ نے اس کو بھی کوئی خوبی عطا کی ہو اور وہ اسی کے ذریعے اس نیکی کا اجر دلا دے۔ میری یہ کتاب اس واقعہ کے بغیر ادھوری تھی کیونکہ یہ واقعہ مجھ سے وابستہ تھا۔ ان صاحبہ سے وابستہ ہے جن کی میں آج بھی قدر دان ہوں اور ان کو انسانیت کی عظمت کا بہت بڑا نشان سمجھتی ہوں جو مذہبی نفرت کی لعنت کو ختم کرتا ہے۔

میں ان صاحبہ کا نام اس لیے نہیں لکھ رہی ہوں کہ ہوسکتا ہے وہ بہت سے لوگوں کے ساتھ نیکی کر چکی ہوں اور وہ اس واقعہ کو بھول چکی ہوں۔ مگر میں ان کا اتنا بڑا احسان کیسے بھول سکتی ہوں۔ مجھے ان کا یہ احسان ہمیشہ یاد رہے گا اور یہ عظیم احسان لکھنؤ کی تہذیب کے ساتھ جڑ کر نہ صرف اس تہذیب بلکہ اس نیکی کو بھی لافانی اور امر کرتا رہے گا۔ واقعی میں ان کی انسانیت لکھنؤ کی تہذیب بن کر ہر طرف اپنا جلوہ دکھانے لگی۔ میں جب لکھنؤ جاتی ہوں تو بہت سے نئے نئے خوبصورت پارک، چوراہوں پر کھڑے اسٹیچو، رِنگ روڈ، ہائی وے اور فری وے جو پہلے نہیں تھے انہیں وہاں دیکھ کر بہت خوشی ہوتی ہے۔ ان میں مجھے ان خاتون کا عکس دکھائی دیتا ہے۔ اگر وہ خاتون تاریخ میں رہیں گی تو لکھنؤ کی تہذیب کی تاریخ میں بھی ان کا ایک خاص مقام ہوگا اور وہ اس میں بھی ہمیشہ زندہ جاوید رہیں گی۔

◆

لکھنؤ کی تہذیب کو اپنے دامن میں چھپانے والے مشاعرے بھی ہیں جن کے ذکر کے بغیر یہ تہذیب تہذیب نہیں ہے۔ ایک وقت ایسا تھا جب لکھنؤ کے گھر گھر میں مشاعرے ہوتے تھے۔ اپنے وقت کے بڑے بڑے شاعر بلوائے جاتے تھے۔ کبھی کبھی یہ مشاعرے مقامی شاعر ہی بلوا کر ہوتے تھے۔ جس گھر میں مشاعرہ ہوتا تھا شاعر وہیں ٹھہرتے تھے یا ہوٹل میں ٹھہرائے جاتے تھے۔ سب پیسے والے امیر لوگ مشاعرے کرواتے تھے۔ میرے ماموں لوگ بھی شاعر تھے اس لیے میرے گھر بھی بہت مشاعرے ہوتے تھے، سب بڑے بڑے شاعر آتے تھے مگر گھر کی عورتیں ان سے نہیں ملتی تھیں یہاں تک چھوٹی بچیاں تک نہیں مل سکتی تھیں۔ والد صاحب، ماموں،

چچا، بھائی اس معاملے میں بہت سخت تھے۔ اگر شاعر اپنے ساتھ خواتین کو لاتے تھے تو ان کو بھی گھر کی یا دوسری مہمان خواتین کے ساتھ بیٹھنا پڑتا تھا۔ مشاعرے کے لیے تیار پنڈال میں نہیں بیٹھ سکتی تھیں۔ وہاں صرف مرد حضرات ہی بیٹھتے تھے۔ مشاعرہ بھی خواتین کے حصّے میں پردے میں بیٹھ کر سننا پڑتا تھا۔ یہ لکھنؤ کی تہذیب کا بہت اہم حصہ یا خصوصیت تھی۔ ہم لوگ اسکول میں اپنے گھر کے مشاعروں کا ذکر نہیں کرتے تھے، کہیں لڑکیاں شاعروں سے ملنے نہ آجائیں یا ان کے دستخط کے لیے اپنی آٹوگراف بک نہ دے دیں۔ اسکول میں اس لیے بھی اپنے گھر میں ہونے والے مشاعروں کا ذکر نہیں کرتے تھے کہ ہوسکتا ہے کہ کچھ لڑکیوں کو یہ عجیب بات لگے کہ اتنے بڑے بڑے شاعر ہمارے گھر آتے ہیں ہم لوگ ان سے نہیں ملتے ہیں۔ جس کے گھر بھی مشاعرہ ہوتا تھا وہ ایک دوسرے کو نہیں بتاتی تھیں۔ ایک بہت مشہور شاعر ہمارے والد صاحب کے شہر کے رہنے والے والد صاحب کے دوست تھے۔ ہم خواتین ان سے کبھی نہیں ملے تھے۔ وہ ہمارے یہاں بہت آتے تھے۔ والد صاحب کے انتقال کے بعد ان کی میرے بھائیوں سے دوستی ہوگئی۔ ہمارا ڈرائنگ روم گھر سے باہر تھا جہاں صرف مرد حضرات بیٹھتے تھے، مہمان عورتیں گھر کے اندر بیٹھتی تھیں۔ اگر بھائی لوگ گھر پر ہوتے تھے تو وہ کھلا رہتا تھا نہیں تو بند رہتا تھا اور باہر سے صرف کنجی لگا دی جاتی تھی تالا نہیں لگایا جاتا تھا۔ شاعر چچا بارہ بنکی سے آتے تھے۔ اگر بھائی ہوتے تھے تو کوئی بات نہیں تھی لیکن اگر بھائی نہیں ہوتے تھے تو وہ خود کنجی کھول کر اندر بیٹھ جاتے تھے۔ تھکے ہوتے تھے تو دیوان پر لیٹ کر آرام فرماتے تھے۔ بھائی نے گھر میں کام کرنے والے ایک لڑکے کو ان کی خدمت کے لیے لگا دیا تھا کہ اگر بھائی گھر پر نہ

ہوں اور شاعر چچا آئیں تو وہ لڑکا ان کے کھانے اور چائے وغیرہ کا خیال رکھے۔ لڑکا فلموں کا بہت شوقین تھا۔ بھائی نے اس سے کہہ دیا کہ ہمارے شاعر چچا فلموں کے گانے لکھتے ہیں۔ وہ لڑکا فلمیں تو بہت دیکھتا تھا مگر اس نے فلموں سے وابستہ کسی کو کبھی دیکھا نہیں تھا۔ وہ لڑکا فلمی شاعر بھیا کا بہت بڑا پرستار بن گیا۔ ان کے آنے پر بہت خوش ہوتا تھا۔ گھر کی عورتوں کو خبر بھی نہیں ہوتی تھی اور خود ہی چائے بنانے کھڑا ہو جاتا تھا۔ چائے بنانے کے بعد امی سے آ کر کہتا تھا۔ ''امی پیسے دے دیجیے۔ شاعر بھیا آئے ہیں ان کے لیے چائے کے ساتھ ناشتہ لانا ہے۔'' اگر چائے کا وقت ہوتا تھا تو امی ناشتے کے پیسے دے دیتی تھیں۔ اگر کھانے کا وقت ہوتا تھا تو وہ کہتی تھیں۔ ''کھانے کا وقت ہے چائے کہاں لیے جا رہا ہے۔'' وہ کہتا۔ ''انہوں نے چائے کے لیے کہا ہے۔'' امی کہتیں۔ ''جاؤ پوچھ کر آؤ کھانے کا وقت ہے کھانا کھا لیں۔'' وہ خوشی خوشی دوڑتا ہوا جاتا اور پوچھ کر آتا۔ شاعر چچا اگر بھوکے ہوتے تو کھانے کے لیے کہہ دیتے اور اگر کھانا کھا کر آئے ہوتے تو کہہ دیتے کہ صرف چائے لے آؤ۔ گھر میں کام کرنے والا وہ لڑکا ان کی اتنی خدمت کرتا تھا کہ گھر کے سب لوگ حیران رہتے تھے۔ ان کا فلم سے تعلق ہونے کی وجہ سے وہ لڑکا ان پر مہربان تھا۔ بھائی یا ہمارے گھر والوں کی وجہ سے نہیں حالانکہ نوکر وہ ہمارے گھر کا تھا۔ جب تک وہ رہتے کمرے کے باہر پہرا دیتا رہتا کہ ان کو کسی چیز کی ضرورت تو نہیں ہے۔ بھائی مذاق میں کہتے۔ ''اگر تم اتنی خدمت ہماری کرتے تو ہم تم کو راجا بنا دیتے۔ شاعر چچا تم کو فلم میں ہیرو بھی نہیں بنا سکے۔'' اس لڑکے کا فلم میں ہیرو کے تصور سے ہمارے گھر میں سب لوگ خوب ہنستے تھے۔ میں جب امریکا سے انڈیا گئی تو ابھی میں اتنا لمبا سفر طے کر کے پہنچی تھی اور بہت

تھکی ہوئی تھی۔ بھائی جلدی سے آئے اور کہا۔ ''چلو چلو شاعر چچا آئے ہیں۔ ان سے تم کو ملواؤں۔'' امی نے کہا۔ ''ابھی بہت تھکی ہے پھر کسی دن مل لے گی۔''

وہ دن کبھی نہیں آیا۔ اُن کا اسی زمانے میں انتقال ہو گیا۔ میں ان شاعر چچا سے کبھی نہیں ملی۔ لکھنؤ کی تہذیب کے ذکر پر یہ واقعہ اپنے آپ یاد آ گیا اور شاعر چچا کو خراج عقیدت پیش کرنے کا موقع مل گیا جن کو میں نے کبھی نہیں دیکھا اور نہ کبھی ملی۔ صرف ان کے نام اور شہرت سے واقف تھی۔ ہمارے شہر میں ہمارے گھر میں رشتے اور دوستی کتنی اہمیت رکھتے ہیں۔ کبھی کبھی اور اچانک آنے والے مہمان کے لیے ایک خاص آدمی مقرر تھا جو ان کا ان کے شایان شان استقبال کر سکے، ان کی خاطر و مدارت کر سکے۔

◆

مشہور ادیب رام لعل صاحب کو دیکھنا بھی ایک دلچسپ اتفاق ہے۔ میں اور میری بہن اپنی دوست سے ملنے لکھنؤ کے ایک محلے پُرانہ حیدر آباد جا رہے تھے۔ میرے بھائی نے کہا کہ وہ ہم کو اور ہماری بہن کو اپنی کار سے وہاں چھوڑ دیں گے۔ ہم لوگ بہت خوش ہوئے۔ میں کئی بار اپنی دوست کے گھر جا چکی تھی۔ مگر اس طرف اتنی سڑکیں تھیں کہ ہم ان کے گھر کا راستہ بھول گئے۔ بھائی نے کار رکوا کر ایک آدمی سے پتہ پوچھا۔ اس نے پتہ بتا دیا۔ مگر اس آدمی کے بتائے پتے سے ہم اپنی دوست کے گھر جانے کے بجائے دوسرے محلے نئے حیدر آباد پہنچ گئے۔ ہم نے کہا یہ جگہ نہیں ہے اور نہ یہ گھر ہے۔ بھائی نے میری بات نہیں سنی اور کار سے اتر گئے اور وہاں پر کھڑے ایک صاحب سے پوچھا۔ ''رام لعل صاحب کا گھر کہاں ہے؟'' انہوں نے ایک گھر کی

طرف اشارہ کردیا جس کے باہر ایک صاحب کھڑے تھے، وہ صاحب بھائی کو لے کر ان صاحب کے پاس پہنچ گئے۔ اتفاق سے ان صاحب کا نام بھی رام لعل تھا اور میری دوست کے والد کا نام بھی رام لال تھا۔ محلے قریب قریب تھے۔ وہ صاحب شائد میری دوست کے والد رام لال کو جانتے تھے، انہوں نے گھر کا پتہ سمجھا دیا۔ ایک دم سے میں نے اُن صاحب کو پہچان لیا اور مجھے ایک دلچسپ واقعہ یاد آ گیا۔ میں نے ان کو کچھ سال پہلے جب میں بہت چھوٹی تھی تب دیکھا تھا۔ میں اپنے بڑے ماموں اور آنٹی کے ساتھ ایک فنکشن میں گئی تھی۔ یہ فنکشن یا نشست شاید مشہور ادیب رام لعل صاحب کے اعزاز میں تھی۔ وہاں بہت سی خواتین اپنے بچوں کو بھی ساتھ لائی تھیں۔ اسٹیج پر ایک جگہ ہم بچے ایک ساتھ بیٹھے تھے اور ساتھ میں خواتین ایک ساتھ بیٹھی تھیں۔ فنکشن شروع ہوا۔ ایک صاحب اور رام لعل صاحب ایک ساتھ مائک کے پاس تشریف لائے اور اُن صاحب نے اُن کا تعارف کروانا شروع کیا اور کہا۔ ''رام لعل صاحب کسی تعارف کے محتاج نہیں ہیں۔ رام لعل صاحب کو سب لوگ جانتے ہیں۔'' ایک دم سے میں نے کہا۔ ''رام لعل صاحب کو ہم بھی جانتے ہیں۔'' پورے ہال میں سب لوگ ہنسنے لگے۔ ان صاحب نے کہا۔ ''آپ شہرت کی انتہا پر ہیں۔ بچے بھی آپ کو جانتے ہیں۔'' رام لعل صاحب نے مجھ سے پوچھا۔ ''بی بی آپ رام لعل کو کیسے جانتی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''رام لال میری دوست کے پاپا کا نام ہے اس لیے میں جانتی ہوں۔'' اس پر لوگ پھر ہنسے۔ رام لعل صاحب نے کہا۔ ''میری شہرت کی ابتدا بھی ہوگئی اور انتہا بھی ہوگئی۔''

دنیا میں کیسے کیسے اتفاقات ہوتے ہیں۔ یہ زبردست اتفاق میرے لحاظ

سے ادب کی دنیا کی تاریخ بھی ہے اور لکھنؤ کی تہذیب کا جز بھی ہے۔

◆

لکھنؤ کی ایک اور خوبی بہت بڑی خوبی جب یاد آتی ہے تو یاد کر کے بھی بہت اچھا لگتا ہے۔غریب لڑکیوں کی شادیاں کروانے کا شوق۔ جب بھی کام کرنے والی بوا یا اسکول میں کام کرنے والی بوا یا کسی بھی غریب کی لڑکی کی شادی طے ہوتی تھی تو بے چاروں کے پاس شادی میں خرچ کرنے کے پیسے نہیں ہوتے تھے۔ سب لوگ ان کی مدد کرنے کے لیے کھڑے ہو جاتے تھے تاکہ عزت کے ساتھ غریب کی بیٹی رخصت ہو جائے۔کہیں سے پیسے آتے تھے کہیں سے جہیز میں دینے کے لیے کپڑے، برتن اور دوسرا ضرورت کا سامان وغیرہ آجاتے تھے۔اس وقت کچھ چیزیں شادی میں دینا بہت ضروری سمجھا جاتا تھا شادی کے بعد کھانا پکانے میں تکلیف نہ ہو اور دلہن کے پاس پہننے کے کپڑے ہوں۔ اسی لیے برتن اور کپڑے دوسرے ضروری سامان کے ساتھ ضرور دیے جاتے تھے۔غریب لوگ شادی کے بعد نہ تو فوراً برتن خرید سکتے تھے اور نہ فوراً پہننے کے کپڑے خرید سکتے تھے۔ جو لوگ پیسوں کی مدد کرتے تھے ان پیسوں سے بارات کو کھانا کھلا دیا جاتا تھا۔سب لوگ پہلے سے ہی طے کر لیتے تھے کہ کس کو کیا دینا ہے۔ہم سب لڑکیاں اس معاملے میں آگے آگے رہتی تھیں۔کوئی ایک لڑکی اسکول میں کسی غریب کی لڑکی کی شادی کی اطلاع دیتی تھی اور اسکول کی سب لڑکیاں مل کر اپنے اپنے گھروں سے شادی کا انتظام کرواتی تھیں۔کبھی کبھی کرائے پر شامیانہ اور کرسیاں اور برتن دینے والے بھی اس کار خیر میں شریک ہو جاتے تھے اور مفت میں سب سامان دے دیتے تھے، حالانکہ وہ بہت امیر نہیں ہوتے تھے کرائے پر سامان دینے سے ہی

ان کا گھر چلتا تھا۔ یہ دیکھ بھال یہ نیکی دلوں کو بہت خوشی اور اطمینان دیتی تھی۔ لکھنؤ سے باہر گاؤں سے آنے والی بوائیں جو گھر گھر ملازمہ کا کام کرتی تھیں ان کو اپنی لڑکیوں کی شادی کا یہ انتظام بہت پسند آتا تھا۔ وہ اپنے گاؤں جا کر لکھنؤ والوں اور لکھنؤ کی بہت تعریف کرتی تھیں۔ اس طرح لکھنؤ کا نام اور اس کی تہذیب کی شہرت پھیل جاتی تھی۔ میں لکھنؤ چھوڑ چکی تھی تب بھی غریب لڑکی کی شادی کا سن کر مدد ضرور کرتی تھی۔ مگر ایک بار تو میں حیران رہ گئی جب پتا چلا کہ گھر کے مالی کی بیٹی کی شادی ہے اور مجھ سے کہا گیا کہ بیچارہ اے سی اور فریج نہیں دے پا رہا ہے، تم ایک چیز دے دو۔ میں نے کہا میں امیروں کی شادی میں اتنی مہنگی چیز نہیں دے سکتی ہوں۔ صرف کسی غریب کی لڑکی کی شادی میں مدد کر سکتی ہوں۔

پورے ہندوستان اور پاکستان سے خاص کر لوگ لکھنؤ اس کی تہذیب کو دیکھنے آتے ہیں۔ لکھنؤ کی زبان اور بات چیت کے انداز کا بھی لطف لینے آتے ہیں۔ یہاں تک اتر پردیش کی دوسری جگہوں کے لوگ بھی لکھنؤ آکر وہاں کے لوگوں میں سنی ہوئی یا پڑھی ہوئی تہذیب کو دیکھنا چاہتے ہیں کہ اس میں کتنی سچائی ہے۔ کانپور جو لکھنؤ کے بہت قریب ہے وہاں کے لوگ بھی لکھنؤ کی تہذیب کا نظارہ کرنے آتے رہتے ہیں۔ ہمارے محلے کی ایک بھابی کانپور کی تھیں۔ ایک بار ان کی بہن ان سے ملنے آئیں۔ وہ لکھنؤ پہلی بار آئیں تھیں۔ انہوں نے لکھنؤ اور اس کی تہذیب کے بارے میں بہت سنا تھا، پڑھا تھا اور فلموں میں دیکھا تھا۔ انہوں نے اپنی بہن سے کہا کہ مجھے لکھنؤ کے لوگوں سے ملنا ہے۔ ان کی تہذیب دیکھنی ہیں جو میں نے سنا ہے۔ وہ ان کو ہمارے گھر لے آئیں۔ اتفاق سے اس دن میری دوستیں آئی ہوئی تھیں۔ ہم لوگوں

نے کھانا ایک ساتھ کھایا تھا۔ پھر شام کو وہ سب ناشتہ کر کے چلی گئیں۔ ان کے جانے کے بعد کانپور والی صاحبہ تشریف لائیں۔ ہم سب لڑکیاں ان سے مل کر بہت خوش ہوئیں۔ جتنی باتیں وہ لکھنؤ اور اس کی تہذیب کی سوچ کر آئیں تھیں ان کا معائنہ انہوں نے ہمارے گھر سے شروع کیا۔ جو بات انہوں نے موجود پائی اُس بات پر دل کھول کر ہنسیں اور ٹھٹھے لگائے۔ سب سے پہلی بات ان کو میری اور میری بہنوں میں لکھنؤ کا حسن اور اس کی نزاکت نظر آئی۔ اُن کے سامنے ناشتے کی بھری ٹیبل میں لکھنؤ کے تکلف کا انداز نظر آیا۔ ان سے کہا گیا کہ شروع کیجیے، انہوں نے کہا۔ پہلے آپ لیجیے۔ ہم لوگوں نے کہا۔ پہلے آپ لیجیے۔ اس بات پر وہ دل کھول کر ہنسیں کیونکہ ان کو ''پہلے آپ پہلے آپ'' کے درشن ہو گئے جس کو وہ خاص کر دیکھنا چاہتی تھیں۔ ان کو پلیٹ بنا کر دی گئی تو انہوں نے ہم لوگوں سے کھانے کو کہا۔ ان کے آنے سے پہلے اپنی دوستوں کے ساتھ ہم لوگ کھا چکے تھے، اس لیے کچھ اور کھانے کی گنجائش نہیں تھی۔ ان کو دکھانے کے لیے ہم لوگ ایک گلاب جامن سے ذرا ذرا سا اٹھا کر چکھنے لگے تو اس میں ان کو لکھنؤ کی نزاکت اور تکلف نظر آیا۔ ایک چھوٹا سا گلاب جامن اس میں کئی لڑکیاں کھا رہیں تھیں۔ ان کے لیے مزاح کا موضوع تھا، مگر جس کو وہ لکھنؤ کے تکلف اور نزاکت کا نام دے رہی تھیں۔ کتنی باتوں میں ان کو لکھنؤ کی تہذیب نظر آئی۔ یہ بات وہ جانیں۔ کچھ ہی باتیں انہوں نے کہیں جو میں نے لکھ دیں۔ لیکن ہم لوگ بھی ہوشیار ہو گئے۔ جب بھی لکھنؤ کے باہر کے لوگ ہمارے یہاں تشریف لاتے تو ہم لوگ ان کو جان بوجھ کر دکھانے لگتے۔ وہ عام خوبیاں جو تہذیب کے نام سے لکھنؤ سے باہر یا پوری دنیا میں مشہور تھیں۔

◆

لکھنؤ کی تہذیب ہم نے لکھنؤ سے باہر جا کر محسوس کی یا لوگوں نے اس کا احساس کرایا۔ ایئر انڈیا کے سفر سے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا۔ لکھنؤ سے کناڈا کے لیے پہلی بار اکیلی نکلی تھی۔ میرے شوہر شادی کے بعد کناڈا واپس جا چکے تھے۔ اب مجھے ویزا ملا تھا تو میں جا رہی تھی۔ اتفاق سے اُس پلین میں اس دن زیادہ تر عورتیں ہی تھیں۔ بہت سی خواتین میری طرح اکیلی شادی کے بعد اپنے شوہر کے پاس جا رہی تھیں۔ پورے ہندوستان، پنجاب، کشمیر، گجرات، بہار، کلکتہ، وغیرہ کے ساتھ یوپی کے دوسروں شہروں کے لوگ بھی تھے۔ لکھنؤ کی میں اکیلی مسافر تھی۔ میرے پاس گجرات کی ایک مسلم خاتون بیٹھی تھیں۔ اُن کی بھی میری طرح نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ ان کے شوہر بھی کناڈا میں تھے اور وہ ویزا ملنے کے بعد کناڈا جا رہی تھیں۔ کھانا سرو کیا گیا۔ اس وقت مجھے بھوک نہیں تھی میں بس چکھ رہی تھی کھا نہیں رہی تھی۔ ان خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ ''آپ کہاں سے آ رہی ہیں۔'' میں نے کہا۔ ''میں لکھنؤ سے آ رہی ہوں۔'' وہ صاحبہ خوشی سے اچھل پڑیں جیسے دنیا کا آٹھواں عجوبہ دیکھ لیا ہو۔ وہ جلدی سے اپنی سیٹ سے اٹھ گئیں اور بھاگتی ہوئی گئیں اور بہت سی خواتین کو بلا لائیں کہ ہم لوگوں کے ساتھ لکھنؤ کی ایک خاتون سفر کر رہی ہیں۔ بہت سی خواتین نے مجھے گھیر لیا۔ میں ڈر گئی کہ یہ لوگ مجھے کیوں گھیرے کھڑی ہیں؟ میں کوئی مشہور ہستی یا ایکٹریس تو نہیں ہوں۔ کیونکہ میں نے مشہور ہستیوں کو یا ایکٹرا ایکٹریس کو اس طرح ہجوم میں گھرا دیکھا تھا۔ وہ لوگ کہہ رہی تھیں پہلی بار لکھنؤ کی کسی لیڈی سے ملاقات ہوئی ہے۔ ہم لوگوں نے صرف فلموں میں لکھنؤ اور لکھنؤ والے دیکھے تھے یا پھر ان کے بارے میں سنا اور پڑھا تھا، کسی سے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔ میں دبلی تھی، ان کو اس

دبلے پن میں لکھنؤ کی نزاکت دکھائی دی۔ میری شکل میں لکھنؤ کی خوبصورتی نظر آئی۔ میں چکھ چکھ کر کھانا کھا رہی تھی۔ ان کو اس میں لکھنؤ کی نفاست اور تکلف نظر آیا۔ان کے ساتھ میں بھی کھڑی ہوگئی۔انہوں نے کہا، کھڑی کیوں ہوگئیں بیٹھیے۔ میں نے ان سے کہا۔ ''پہلے آپ لوگ بیٹھیے تو میں بھی بیٹھ جاؤں گی۔'' تو ان کو پہلے آپ پہلے آپ دکھائی دیا۔ بات چیت میں لکھنؤ کی میٹھی ہندی دکھائی دی۔ بات کرنے کے انداز میں نوابی پن دکھائی دیا۔ اب کیا بتائیں ان سب پیاری خواتین کو مجھ میں صرف مجھ میں لکھنؤ کی تہذیب سے تعلق رکھنے والی کیا کیا باتیں نظر آئیں جن کا بتانا مشکل ہے۔ جب تک وہ خواتین ساتھ رہیں وہ مجھ میں لکھنؤ ڈھونڈتی رہیں اور ڈھونڈ ڈھونڈ کر نکالتی رہیں۔ میری حیرت کی انتہا نہیں تھی۔ لکھنؤ سے ان کا اتنا پیار مجھے بہت پسند آیا۔اس دن مجھے پہلی بار معلوم ہوا کہ مجھ میں لکھنؤ کی اتنی خوبیاں ہیں جو پوری دنیا پورے ملک میں مشہور ہیں، مگر ہم لکھنؤ والوں کو نہیں معلوم ہیں، کیونکہ ہم لکھنؤ والے لکھنؤ سے باہر کبھی نہیں گئے تھے۔ ہم تو پورے ملک والوں کو اپنے جیسا ہی سمجھتے تھے۔ پھر ہم کناڈا پہنچ گئے۔ پلین کی بہت سی خواتین سے میری دوستی ہوگئی اور وہ دوستی آج تک قائم ہے۔

نئے ملک نئے شہر میں بہت سی سہیلیاں بن گئیں۔ایک دوسرے کے گھر آنا جانا شروع ہوگیا۔ بڑی بڑی دعوتیں ہونے لگیں۔ میں ایک دعوت میں گئی۔ بہت بھیڑ تھی۔عورتوں اور آدمیوں کے لیے الگ الگ میزوں پر کھانا لگا تھا۔ ایک طرف آدمیوں کی لائن تھی دوسری طرف عورتوں کی لائن تھی۔ میں عورتوں کی لائن میں دوسرے نمبر پر کھڑی تھی۔ میرے آگے کھڑی خاتون کا نمبر آ گیا تو میں سب سے آگے

ہوگئی اور میرا نمبر آ گیا۔ جب میرا نمبر آیا تو میں نے اپنے پیچھے کھڑی خاتون کو جانے کا اشارہ کر دیا وہ خوشی خوشی چلی گئیں۔ اس کے بعد میں نے پھر اپنے پیچھے کھڑی خاتون کو جانے کے لیے کہہ دیا۔ یہ انوکھا منظر دیکھ کر ایک میاں بیوی میرے پاس آئے اور بولے۔ ''معاف کیجیے گا ہم لوگ معلوم کرنا چاہتے ہیں کیا آپ لکھنؤ کی ہیں؟'' میں نے کہا۔ ''ہاں آپ کو کیسے معلوم ہوا؟'' انہوں نے کہا۔ ''آپ کے 'پہلے آپ، پہلے آپ' کے برتاؤ سے۔ آپ اپنی باری آنے پر خود نہ جا کر دوسروں کو جانے دے رہی تھیں۔ اس طرح تو آپ کی باری کبھی نہیں آئے گی اور کھانا ختم ہو جائے گا۔ آیئے آپ ہم لوگوں کے ساتھ چلیے۔''

یہ بات مجھ کو چونکا گئی۔ میں لکھنؤ کی تہذیب کا مظاہرہ نہیں کر رہی تھی بس دوسروں کو اپنے سے پہلے جانے کا موقعہ دے رہی تھی اور وہ لوگ موقعے سے فائدہ اٹھا رہی تھیں۔ یہ خوبی بھی میری نہ رہ کر لکھنؤ سے جڑ گئی تھی۔ ایک دن میں انڈین گروسری اسٹور پر گئی۔ ہمیشہ جانے کی وجہ سے اس اسٹور کی مالک خاتون سے میری دوستی ہوگئی تھی۔ جب میں اپنی چیزیں لے کر گئی تو وہ خاتون مجھ سے باتیں کرنے لگیں۔ میرے پیچھے کھڑے میاں بیوی نے ان خاتون سے پوچھا۔ ''آپ کی بھاشا (زبان) کتنی میٹھی ہے، آپ کہاں کی رہنے والی ہیں؟'' خاتون نے جواب دیا۔ ''یہ لکھنؤ کی رہنے والی ہیں۔'' وہ دونوں میاں بیوی ایک ساتھ بولے۔ ''تب ہی اتنی میٹھی ہندی بول رہی ہیں۔'' وہ دونوں میاں بیوی اڑیسہ کے رہنے والے تھے۔

جب کوئی خاتون بیمار پڑتی تھیں یا کسی کے یہاں بے بی آنے والا ہوتا تھا تو ان کی حالت دیکھ کر مجھے افسوس ہوتا تھا کہ اپنے وطن سے دور ہیں۔ ان کا اپنا بھی

یہاں کوئی نہیں ہے۔ میں پندرہ دن کا کھانا بنا کر ان کے گھر لے جاتی اور الگ الگ ڈبوں میں کر کے ان کے فریزر میں رکھ دیتی تاکہ روزانہ نکالنے میں آسانی رہے۔ اور انہیں کچھ دن کھانا نہ بنانا پڑے اور وہ آرام کریں۔ سب حیران رہ جاتی تھیں۔ اس کو بھی وہ میری خصوصیت نہیں کہتیں لکھنؤ اور اس کی تہذیب سے جوڑ دیتی تھیں۔ بہت سی خواتین شادی ہو کر دوسرے ملک آ گئیں تھیں، مگر وہ لوگ کھانا بنانا نہیں جانتی تھیں اور اپنے گھر کے بنے کھانے کو ترستی تھیں۔ ان کا تعلق میرے صوبے سے بھی نہیں تھا۔ ان کے کھانوں کے نام بھی فرق تھے۔ کچھ خواتین کھٹا کھانا پسند کرتی تھیں۔ میں ان کو ان کا کھانا بنا کر کھلاتی تھی جو ان کو بہت پسند آتا تھا، جبکہ میں نے ان کھانوں کا نام نہ پہلے سنا تھا اور نہ لکھنؤ میں کبھی پکایا تھا اور نہ کبھی کھایا تھا۔

ایک بار میں واک پر جا رہی تھی۔ ایک خاتون میرا راستہ روک کر کھڑی ہو گئیں اور میرا ہاتھ پکڑ لیا۔ میں ان کو پہچان نہیں پائی۔ انہوں نے خود کہا۔ ''ہم لوگوں نے ایک ساتھ اکاؤنٹنگ فار ونڈوز کا کورس کیا تھا۔ تم کتنی اچھی اور سب سے مختلف تھیں۔ ہم سب کی کتنی مدد کرتی تھیں۔ سب کا کتنا خیال رکھتی تھیں۔ کوئی کچھ پوچھتا تھا تو اپنا کام چھوڑ کر اس کو سکھانے لگتی تھیں۔ میں نے ایسا انسان نہیں دیکھا۔ تم انڈیا والے کتنے اچھے ہو۔''

مجھے کچھ بھی نہیں یاد تھا۔ وہ اورینٹل لیڈی تھی۔ میری خوبیوں میں ان کو انڈیا نظر آیا۔ مجھے یہ سن کر بہت خوشی ہوئی۔ ان کی جگہ کوئی دیسی خاتون ہوتیں تو لکھنؤ کی تہذیب کی شان میں قصیدے پڑھ رہی ہوتیں۔

لکھنؤ کی تہذیب سے وابستہ بہت سی چیزوں کو لوگوں نے مزاح بنا لیا ہے۔

جیسے لکھنؤ کے نوابوں کا، پہلے آپ پہلے کا واقعہ، پہلے آپ پہلے آپ میں ان کی ٹرین چھوٹ جاتی ہے، لیکن اس پہلے آپ پہلے میں دوسروں کے لیے کتنا احترام کتنی عزت چھپی ہوتی ہے اس پر بھی لوگوں نے غور کیا ہے یا نہیں۔ میں نہیں بتا سکتی، مگر اتنا کہہ سکتی ہوں کہ اپنے لیے تو سب ہی جیتے ہیں، مگر اپنے سے پہلے دوسرے کو موقعہ دینا بہت بڑی بات ہے۔ یہی چیز تہذیب بن کر پوری دنیا پر چھا گئی۔ کھانا خود پہلے نہ شروع کرنا دوسرے کو پہلے شروع کرنے کی دعوت دینا۔ آگے ہوتے ہوئے بھی دروازہ کھول کر دوسرے کو پہلے جانے کا موقع دینا۔ یہ دو مثالیں ہی کافی نہیں ہیں۔ پہلے آپ پہلے کو سمجھنے اور سمجھانے کے لیے ایسی کتنی مثالیں ہیں۔ جب وہ دوسروں کے سامنے آتی ہیں تو لوگ کہہ اٹھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کے ہیں یا لکھنؤ کی ہیں تب ہی آپ میں یہ تہذیب دکھائی دے رہی ہے۔ لکھنؤ والوں کو پتا ہی نہیں ہوتا ہے کہ وہ کسی تہذیب کا مظاہرہ کر رہے ہیں۔ وہ تو ان کی عادت ہوتی ہے۔ ان کی زندگی کا معمول ہوتا ہے۔ لکھنؤ کا تکلف تین طرح سے میرے سامنے آیا جو حیرت میں مبتلا کر گیا۔ جب مہمان کے گھر میں آنے پر کھانے پینے کا اہتمام لکھنؤ کا تکلف کہلاتا ہے جب کہ ہر جگہ کے لوگ مہمانوں کے لیے اہتمام کرتے ہیں۔ کسی کے گھر جانے پر کھانے کے لیے انکار کرنا لکھنؤ کا تکلف کہلاتا ہے۔ ذرا ذرا سی چیز اٹھا کر کھانا یا چکھنا لکھنؤ کا تکلف کہلاتا ہے۔ دبلا پتلا ہونا لکھنؤ کی نزاکت کہلاتی ہے۔ دوسرے شہر کے لوگ سلم کہلاتے ہیں۔ اگر کوئی بھاری چیز ہم لکھنؤ والوں سے نہیں اٹھتی ہے تو وہ بھی لکھنؤ کی نزاکت کہلاتی ہے۔ دوسرے شہر کے لوگ اگر بھاری چیز نہیں اٹھا پاتے ہیں تو وہ چیز بھاری کہلاتی ہے جس کو اٹھانے کے لیے کسی اور کی مدد کی ضرورت ہوتی ہے۔ جب میں ہائی اسکول میں تھی تو

کبھی کبھی میں بھی امی، ٹیچرز یا دوسرے بڑوں کا دھیان یا اٹینشن پانے کے لیے لکھنؤ کی نزاکت کا مظاہرہ کر دیتی تھی۔ جیسے ایک بار ایک بھاری میز اسکول میں بہت سی لڑکیاں اٹھانے کی کوشش کر رہی تھیں، مگر اٹھا نہیں پا رہی تھیں۔ ان کو کسی اور کی مدد کی ضرورت تھی۔ ٹیچر نے مجھ سے کہا۔ ''جاؤ ان کی مدد کرو۔'' مجھے بھی اپنی نزاکت دکھانے اور ٹیچر کا دھیان اپنی طرف لینے کا موقع مل گیا۔ میں میز کے پاس گئی اور جھوٹ موٹ اٹھانے کی اداکاری کی جیسے میز بہت بھاری ہے۔ مجھ سے نہیں اٹھ رہی ہو۔ ٹیچر غور کر رہی تھیں۔ وہ خود آ گئیں اور کہا۔ ''میں نے بھی کس کو مدد کے لیے بھیج دیا۔ یہ نازک ادا کہاں میز اٹھانے میں مدد کر پائیں گی۔'' ٹیچر نے خود مدد کی اور ان کی مدد سے میز اٹھ گئی۔ میری مدد سے بھی میز اٹھ جاتی مگر مجھے تو اپنی نزاکت دکھانا تھا اور نزاکت کا عنوان اور ٹیچر کا دھیان حاصل کرنا تھا۔ ایسے ہی ایک بار امی نے کہا۔ ''جاؤ وہ کرسی اٹھا لاؤ۔'' میں کرسی اٹھانے کے بجائے اس پر ہاتھ رکھ کر کھڑی ہو گئی جیسے مجھ سے نہیں اٹھ رہی ہے۔ امی میرے نخرے کو سمجھ گئیں اور کہا۔ ''ہٹو لکھنؤ کی ساری نزاکت تم میں سما گئی ہے۔ تم سے یہ کرسی کیسے اٹھے گی۔'' اور وہ خود کرسی اٹھا کر لے گئیں۔ اس وقت میری ایک بہن برا مان گئیں اور لکھنؤ کی خاص زبان میں بولیں۔ ''تم اتنا بنتی کیوں ہو۔'' میں نے کہا۔ ''آپ بھی بن جایئے آخر آپ بھی تو لکھنؤ کی ہیں۔'' انہوں نے جواب دیا۔ ''میں کیوں بنوں میں تو بنی بنائی ہوں۔'' لیکن پھر بھی میں اور دوسری لڑکیاں اکثر لکھنؤ کی نزاکت کا مظاہرہ کرتی رہتی تھیں۔ ایسا کرنے اور لکھنؤ کی نزاکت سننے اور بننے میں ہم لوگوں کو بہت مزہ آتا تھا۔ میں نے لکھنؤ اور اس کی نزاکت کے بارے میں بہت پڑھا اور بہت سنا تھا۔ لکھنؤ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ شاعروں نے

بھی اپنا کمال دکھایا اور لکھنؤ کی ساری نزاکت اپنے شعر میں ڈال دی:

کیلا کھانے سے میرے دانت ہلے جاتے ہیں
فرش مخمل پر میرے پاؤں چھلے جاتے ہیں

مجھے معلوم نہیں ہے کہ یہ شعر لکھنؤ والوں پر لکھا گیا ہے کہ نہیں، مگر لکھنؤ والوں کے لیے پڑھا ضرور جاتا ہے۔ اس کی گواہ میں بھی ہوں۔ ہم لوگ اکثر اسکول میں الوداعی پارٹی یا فیرویل پارٹی کے موقعے پر کسی ایک سینئر لڑکی کو اس شعر کا ٹائٹل ضرور دیتے تھے۔ لکھنؤ کی شیریں زبان کی تعریف یا قصیدے بھی بہت مشہور ہیں۔

لکھنؤ کی شہد میں گھلی میٹھی اور شیریں زبان آج بھی لوگوں کو متأثر کرتی ہے۔ 'آپ'، 'حضور' کے سانچے میں ڈھلی زبان اب شاید ختم ہوگئی ہے۔ صرف بات چیت کا تھوڑا بہت انداز ہی رہ گیا ہے۔

بات چیت کا ایک خاص انداز لکھنؤ والوں اور خاص کر عورتوں میں پایا جاتا ہے جو ان کو دوسروں سے منفرد کر دیتا ہے وہ ہے اپنی گفتگو میں اللہ کا بہت زیادہ استعمال کرنا۔ یہ خوبی اپنی الگ خصوصیت رکھتی ہے اور لاجواب ہے۔ لکھنؤ کی خواتین بات بات میں اللہ بولتی ہیں۔ ہائے اللہ اور ہائے رام کہنا تو دونوں مذہبوں کی عورتوں کی ادا کہلاتی ہے۔ یہ ہائے اللہ بھی لکھنؤ کی زبان میں غضب کی خوبصورتی اور دلکشی لے کر نمودار ہوتا ہے۔ لیکن اپنی گفتگو میں ہر وقت اللہ کا استعمال بھی اپنی مثال آپ ہے۔ کسی سے کچھ مانگنا ہے یا کوئی کام کروانا ہے یا کوئی ریکویسٹ کرنی ہے تو عام گفتگو میں جملہ شروع کرنے سے پہلے اللہ ضرور لگا ہوتا ہے۔ مثال کے طور پر دو چار جملے لکھ رہی ہوں۔ ویسے اگر لکھے جائیں تو لاکھوں جملے کم پڑ جائیں۔ جیسے کسی سے کچھ مانگنا ہو

تو کہتی ہیں۔''اللہ ہم کو دے دیجیے۔''اس کے علاوہ بھی بہت سے جملے بولتی ہیں، اللہ ہمارے ساتھ چلیئے، اللہ ہمارا کام کر دیجیے۔اللہ ہم کو معاف کر دیجیے، اللہ ہم کیا کریں، اللہ آج تم کھانا پکادو، اللہ نہ کرے، اللہ پریشان نہ کرو، اللہ کے لیے اٹھ جاؤ، اللہ ہمارے گھر آؤ، اللہ تم کو کیا ہو گیا ہے، اللہ اللہ کتنا خوبصورت دن ہے وغیرہ وغیرہ۔ ایسے ہزاروں جملے ہیں جو روزمرہ کی زبان کا حصّہ ہیں اور لکھنؤ کی عورتیں بولتیں ہیں۔ جوش ملیح آبادی صاحب نے لکھنؤ کی عورتوں کی زبان کی اس خصوصیت پر غور کیا اور پسند کیا۔خاص کر اپنی کتاب ''یادوں کی بارات'' میں لکھا ہے:''لفظ اللہ لکھنؤ کی خواتین پلیز کی طرح استعمال کرتی ہیں یعنی پلیز کے سینس میں استعمال کرتی ہیں۔''

جوش صاحب کی بدولت یہ نئی بات ہم لوگوں کو معلوم ہوئی اور ہم لوگوں کو ان کی یہ بات سچ لگی۔واقعی میں یہ پلیز کی طرح بولنے کا ہی ایک طریقہ ہے۔بہت سے لوگ سمجھتے ہیں کہ یہ عورتوں کا تکیہ کلام ہے مگر میں کہوں گی کہ بات چیت کا یہ ایک خاص انداز ہے جو اللہ کی محبت اور عقیدت کا اظہار بھی کرتا ہے۔تب ہی لکھنؤ کی خواتین کی زبان پر اور گفتگو میں ہر وقت اللہ کا نام رہتا ہے۔لکھنؤ میں اپنی چیزیں یا اپنا سامان بیچنے والے جیسے مونگ پھلی، ترکاریاں اور پھل بیچنے والے، ٹھیلوں پر کپڑے سویٹر بیچنے والے اور دوسرے لاتعداد سامان بیچنے والے اپنا سامان گا گا کر بیچتے تھے۔کبھی کبھی ان کے گانوں میں بہت خوبصورت زبان اور کلام کا استعمال ہوتا تھا جس کو سن کر لوگ بہت متاثر ہوتے تھے۔ یہ دو باتیں جن کا ذکر نہ کیا جائے تو لکھنؤ کی تہذیب ادھوری رہ جائے گی۔

◆

لکھنؤ کی اَن سنی، دیکھی اور محسوس کی ہوئی تہذیب کی باتوں میں پڑھنے والوں، سننے والوں اور دیکھنے والوں کو نہ کوئی نئی بات دکھائی دے گی اور نہ کوئی خاص بات نظر آئے گی۔ دنیا کے بہت سے لوگوں میں یہ باتیں ہوں گی۔ ایک بار لوگوں نے لکھنؤ کی تہذیب کے بارے میں مجھے کچھ لکھنے کو کہا۔ میں نے ایک مضمون لکھ دیا۔ ایک صاحب نے اس کو پڑھ کر کہا۔ ''کیا صرف لکھنؤ والوں میں یہ خوبیاں ہیں۔ ہم لوگوں میں یا ہمارے شہر کے لوگوں میں یہ خوبیاں نہیں ہیں۔'' میں نے جواب دیا تھا۔ ''پوری دنیا کے لوگوں میں یہ خوبیاں ہیں اور ہوسکتا ہے کہ لکھنؤ والوں سے زیادہ ہوں، مگر وہ خوبیاں ان کی صرف ان کی کہلاتیں ہیں۔ نجی ہوتی ہیں۔ ان کی ہی تعریف کی جاتی ہے ان کے شہر، ملک یا صوبے کا نام نہیں جڑا ہوتا ہے اور نہ لیا جاتا ہے۔ ہماری خوبیوں کے ساتھ لکھنؤ جڑ جاتا ہے اور وہ خوبی ہماری نہ ہو کر لکھنؤ کی ہو جاتی ہے اور لکھنؤ کی تہذیب بن جاتی ہے۔ ہم لوگوں میں لوگ لکھنؤ دیکھنے لگتے ہیں۔''

واقعی میں سب پر یہ واقعات گزرے ہوں گے۔ مگر یہ سب چھوٹی چھوٹی باتیں ان سے وابستہ ہوں گی صرف ان سے۔ لیکن اس کتاب کی باتیں مجھ سے وابستہ ہوتے ہوئے بھی میری نہیں ہیں۔ ان پر لکھنؤ کی تہذیب کی چھاپ لگی ہوئی ہے۔ یہی چیز ان کو عظیم بناتی ہے۔ اِن گزرے، سنے، دیکھے اور محسوس کیے ہوئے واقعات کو اعلیٰ ثابت کرتی ہیں۔ ہمارا کردار، ہماری باتیں، ہمارے واقعات لکھنؤ کی تہذیب کی طرف اشارہ کرتے ہیں اور دوسرے لوگ فخر سے کہتے ہیں۔ ''آپ لکھنؤ کی ہیں یا آپ لکھنؤ کے ہیں تب ہی آپ کے کردار میں ایک تہذیب ہے۔'' اور یہ باتیں میرا اور سب کا فخر بن جاتی ہیں۔ لکھنؤ کا فخر بن جاتی ہیں۔ ایک تہذیب کا فخر بن جاتی ہیں

اوراعلیٰ کردار کی رہنمائی کرنے لگتی ہیں۔لکھنؤ کو بہت بلندی پر لے جاتی ہیں اوراس کا اقتدار بن جاتی ہیں۔سب میں، پورے ملک اور پوری دنیا کے لوگوں میں تہذیب نہیں ڈھونڈھتے ہیں صرف لکھنؤ والوں میں ڈھونڈھتے ہیں اور جب کسی میں وہ لوگ سنی ہوئی یا پڑھی ہوئی تہذیب دیکھتے ہیں تو ایک مثال بنا کر کہہ اٹھتے ہیں کہ آپ لکھنؤ کی ہیں یا لکھنؤ کے ہیں۔لکھنؤ خود تہذیب نہیں ہے اس کے رہنے والے ہی اس کی تہذیب کی وراثت کو اپنے اندر چھپائے ہیں۔ بہت سے لوگوں کو خود بھی نہیں معلوم ہوتی ہیں صرف دیکھنے والے دیکھ لیتے ہیں اور محسوس کرنے والے محسوس کر لیتے ہیں جیسے ان کو اس تہذیب اوراس تہذیب کی سنی ہوئی باتوں کی تصدیق ہو جاتی ہے۔پوری دنیا کے لوگوں کے اچھے کاموں اور نیکی کے کاموں کا کریڈٹ اورتعریف ان کو ہی جاتی ہے مگر ہم لکھنؤ والوں کی نیکی ہمارے اچھے کام کا کریڈٹ اور تعریف لکھنؤ کو جاتی ہے جو ہمارے لیے فخر بن جاتی ہے اور یہ فخر ہمیں احساس دلاتا ہے کہ لکھنؤ سے ہم دور نہیں ہیں۔ہم اپنے شہر سے جدا نہیں ہوئے ہیں۔لکھنؤ ہمارے ساتھ ساتھ ہے۔ہم لکھنؤ کو اپنے ساتھ لے آئے ہیں، کیونکہ دوسرے لوگ ہم لکھنؤ والوں میں لکھنؤ کو ڈھونڈھ لیتے ہیں اور بہت متأثر بہت خوش ہوتے ہیں۔ دعا ہے کہ لکھنؤ کا کردار لکھنؤ کی خصوصیات ہمیشہ قائم رہیں۔آسمان کے چاند تاروں کی طرح چمکتی رہیں اوراپنے نور سے پوری دنیا کو روشن رکھیں۔ پوری دنیا فخر سے یہ کہہ اٹھے کہ یہ خصوصیات تو ہم سب میں ہیں مگر صرف لکھنؤ والوں میں ہی نہیں ہیں۔لکھنؤ والے اپنی تہذیب کا اپنے فخر کا پرچم بلند کر کے ہر ایک سے کہیں یہ خوبیاں لکھنؤ میں ہیں تب ہی تو ہم لکھنؤ والوں میں بھی ہیں۔پوری دنیا اوراپنے ملک کی نئی نئی سرکاریں اپنی پوری طاقت لگا کر بھی لکھنؤ کی

تہذیب، اس کی زبان مٹانے کی کوشش کریں گی تب بھی کامیاب نہیں ہو پائیں گی۔ لکھنؤ ایک تہذیب کا نشان تھا، تہذیب کا نشان ہے اور سدا تہذیب کا نشان بن کر انسانیت کی بلندی کو چھوتا رہے گا اور ہم لکھنؤ والے فخر سے کہتے رہیں گے:

چاہے جہاں رہوں میں وہ بھی میرا جہاں ہے
میری زندگی میں لیکن شانِ اودھ نہاں ہے
اس کو تکبر نہ کوئی سمجھے یہ فخر ہے میرا
جو کچھ لکھا ہے میں نے وہ لکھنؤ کی زباں ہے
تہذیب و تمدن شیریں زبان اور دل فریبی
اس پیاری سر زمیں کا یہ احسان بھی عیاں ہے
لکھتی رہوں ہمیشہ رکے قلم نہ میرا
میری زبان اردو تیرا دیا بیاں ہے

◆ ÷ ◆